ebooks.i360.pk
درِ دلکشا
منظور الٰہی

منظور الٰہی

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیرِ سرو و سمن درآ
تُو زِ غنچہ کم نہ دمیدۂ، درِ دل کُشا بچمن درآ

بیدل

دل بکسے نباختہ، با دو جہاں نساختہ
من بحضورِ تو رسم، روزِ شمار ایں چنیں

اقبال

فہرس

فہرس

بزمِ خاص است درو نقطہ بدستور بیار
معنیِ دور طلب کن ، سخنِ دُور بیار
(نظیریؔ)

وقت اور حادثات ہماری شخصیت پر تعمیری اور تخریبی تجربے کرتے رہتے ہیں۔ ہر لحظہ ہم کچھ کھوتے کچھ پاتے ہیں لیکن کیا جبلّی طور پر ہم بدل بھی جاتے ہیں ؟ شاید یہ کہا جا سکے کہ ایک اہم حادثہ ہو جانے کے بعد ہم وہ نہیں رہتے جو پہلے تھے .... وقت گزر جاتا ہے یا ہم خود گزر جاتے ہیں ؟ وہ شخص جسے مَیں جانتا تھا غبارِ کارواں میں کھو گیا ، پھر اُس خاک سے اِک اور ہستی نے جنم لیا جو مجھ سے تکلف دہ طور پر مختلف تھی ، جیسے کوئی اجنبی ہو۔

عُمر کے اوّلیں سال اباّ کے رعب تلے گزرتے رہے۔ سخت گیر باپ اور شفیق ماں کا اشتراک ، ایک بے خوف ، دُھن کا پکاّ ، دانائے دنیا اور انسان دوست ، ایک سچاّئی اور سادگی کی تصویر ، ریا اور منافقت کے خلاف برسرِ پیکار " لینا اِک نا دینے دو " اباّ کے ملاقاتیوں کا تانتا ، خطوط کے پلندے ، دوستوں کا ہجوم ، پارٹیاں ، سول لائینز میں وسیع بنگلہ اور متوسط طبقہ کی آسودگی ، ماں باپ کے زیرِ سایہ زندگی کے ابتدائی برسوں میں بہت سی چیزیں دیکھ ڈالیں ، قدرت نے اپنے بہترین عطیے بن مانگے دے دیئے تھے۔

بچپن میں پھول اخبار کا انتظار رہتا تھا، پھر ادبی دنیا، ہمایوں اور ساقی کا۔ دارالاشاعت کی مطبوعات سے لے کر دورِ حاضر کے ادب تک بہت سی نگارشات سے شناسائی ہوئی۔ عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول، شبلی نعمانی کے سوانح، ڈپٹی نذیر احمد کے کردار، منشی پریم چند کی کہانیاں، عظیم بیگ چغتائی کا مزاح، شفیق الرحمٰن کے افسانے حفیظ کے گیت، جوش کی نظمیں، اختر شیرانی، فیض اور راشد کی کتابیں اُس راستے میں بکھری ہیں جو میں چل کے آیا ہوں، وہ راستہ اب بھی شاداب وآباد ہے۔ اُوپر تلے کئی سال گزر گئے لیکن وہ کہکشاں پُرافشاں ہے۔

کرنیں، لہریں، شگوفے، مدّوجزر، میرے عنفوانِ شباب کے ساتھی، اُن کی خوشبو ذہن میں بسی ہے۔ وہ ہلکی پھلکی چیزیں تھیں جو مجھے اچھی لگیں۔ میں نے انہیں ناقدانہ انداز سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ عمر بھی ایسی نہیں ہوتی۔ مجھے اُن کرداروں سے اُنس تھا، اُن کے ساتھ یگانگی کا احساس تھا۔ شاید اُن افسانوں میں میں وُہ بے لوث محبّت ڈھونڈتا تھا جو مجھے نصیب نہ تھی اور یہ سوال ذہن میں گونج جاتا۔ پس منظر وہی ہے، وہی آسودہ حالی ڈرائینگ روم اور گرمیوں میں پہاڑ پر چلے جانا، پھر اس محرومی کا سبب؟ محبّت کے معمّے میرے لیے سربستہ راز رہے اور جذبات کا دھارا راستہ نہ پاکر لوٹ کے آتا رہا، احساسِ تنہائی دل پہ شبخوں مارتا رہا، اب یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ شخص جس نے ذہنی کرب سہا، جو اُلجھنوں میں پڑا رہا کوئی اور تھا، مجھ میں اور اُس میں مماثلت کم، اختلاف زیادہ ہے۔

کلامِ اقبال نے سوز و دروں بخشا، زندگی کی راتیں اُس کے جذب و سرور میں بسر ہوئیں۔ اوّلیں دنوں میں اقبال کی طویل نظم "شکوہ" کہیں سے ہاتھ لگ گئی اور چند بار پڑھنے سے ازبر ہوگئی، معنی سے ناآشنائی تھی، تلفظ غلط ہوگا۔ سات برس کی عمر کیا عمر ہوتی ہے لیکن اس تعارف سے اقبال کے ساتھ ایک لافانی رشتہ قائم ہوگیا، زندگی

کے مختلف مدارج میں اُن کا کلام جمالیاتی اور معنوی طور پر مختلف نظر آیا اور ہر بار اُس گل چینی نے قندِ مکرّر کا مزا دیا، مسئلہ وحدانیت، عشقِ رسول ؐ، آدمیت، احترامِ آدمی، عزتِ نفس استقلال، مَیں نے اپنا دِیا اُس شمعِ فروزاں سے جلایا، اقبال کے احسانات سے گردن زیرِ بار ہے۔ اُس "مرشدِ روشن ضمیر" کے طفیل زندگی کے دقیق نکتے روشن ہوئے۔

میں ایسا ذہین طالب علم نہیں تھا لیکن مجھے یہی بتلایا گیا کہ میرے لیے آئی سی ایس کے امتحان میں کامیاب ہونا مشکل نہیں۔ اُن دنوں انڈین سول سروس ایک کامیاب زندگی کا معراج تھی، مجھے تعجب ضرور ہوتا کہ لوگ میرے بارے میں حُسنِ ظن رکھتے ہیں اور جب محض اتفاق سے ایم اے کے امتحان میں یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن آگئی تو عزیزوں کی خوش فہمی یقین میں بدل گئی۔

تعلیم ختم کر چکنے کے بعد کوئی مجھ سے کہتا کہ تم جلد خاکی وردی پہن لوگے تو میں ہنس کے ٹال دیتا لیکن چھ برس خاکی وردی معہ پیتل پالش اور اسٹارچ کے میرے بدن سے چمٹی رہی، دلّی اور بمبئی کے دفتروں میں، شمالی برما کی دلآویز پہاڑیوں میں جہاں ایک آئرش کرنل کی معیت میں دو پُرسکون سال گزرے تھے۔ جنگ کے شعلے سرد پڑ چکے تھے، برما میں معاشی بدحالی تھی لیکن وہاں کے سبزہ زار بدستور حسین تھے، انہی دنوں ڈیرہ دُون اور شملہ کی امتحان گاہ میں ایک انٹرویو ہوا اور میں نے خاکی وردی پُرانے کوٹ کی طرح اُتار پھینکی، ٹیسٹ کے لیے جاتے وقت میں نے امّی سے کہا تھا: "میں تو آپ کو ملنے کے لیے برما سے آگیا ورنہ دس ہزار عرضیاں ہیں، مَیں کس گنتی شمار میں ہوں"۔ جب سول سروس کا بلاوا آیا تو کرنل نے شفقت بھری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا: "میرے عزیز! انتظامیہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا تمہارے بس کا روگ نہیں، ضلع کی پرابلمز سے تم چھلنی ہو جاؤ گے"۔ لیکن فرض کی ادائیگی کا تقاضا تھا کہ اس صدا پر لبیک کہا جائے، گوشہ ہائے عافیت تو اور بھی تھے لیکن یہ صدا سب کی قسمت میں نہیں ہوتی........

آتش داں پہ شمسہ کی تصویر دیکھ کر عمرِ رواں کا ایک ایسا لمحہ یاد آجاتا ہے جو پھڑپھڑاتا ہوا کسی نامعلوم دنیا کی طرف اُڑ گیا تھا، زیریں ہونٹ کا لطیف جھکاؤ اور وہ مسکراہٹ جس میں دانتوں کی لڑی صاف نمایاں ہے، اِس ہنسوڑ لڑکی کے چاہِ غبغب تصویر میں بھی نہیں چھپتے ــــ چنچل، ایک لمحہ کے لیے بھی نہ بیٹھنے والی شمسہ ہنسی میں بے تکلف سادگی جیسے کانچ کی گولیاں سنگِ مرمر کے فرش پر لڑھکتی جائیں، لڑھکتی جائیں....

شمسہ سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء کے موسمِ بہار میں ہوئی تھی، کسی صاحب سے ملنے گیا تو ان کی بیگم نے تعارف کرایا" ان سے ملیے میری چھوٹی بہن لکھنؤ سے آئی ہیں" بڑی بڑی آنکھیں، تنگ ماتھا اور گوندھی ہوئی ملاحت، آداب آداب کے بعد اُردو ادب پر جو بات شروع ہوئی تو ختم ہونے میں نہ آئی ۔ بلا کا حافظہ تھا اُس لڑکی کا، بالآخر میں نے ہاتھ جوڑ دیئے کہ اُستاد مانتا ہوں ۔

موسمِ گرما کے بے کیف دنوں میں کئی شامیں اُس کی رفاقت میں بسر ہوئیں ۔ وہ شامیں جو شمسہ کے ادبی ذوق اور لطیفہ گوئی کی آئینہ دار تھیں ۔ شاعری کے لطیف پہلوؤں پہ بحث چھڑ جاتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو ۔ اقبالیات، جگر، حسرت، اصغر، جوش، مجاز، جذبی، اختر الایمان ...... کبھی شام کو صحنِ چمن میں کرسیاں نکلوالی جاتیں ۔ چھٹک چاندنی مہربان ماں کی طرح مسکراتی، ہوا کے جھونکے ہلکورے دیتے .... اور باتوں کی بنسری بجتی، بھولی بسری باتیں، گاؤں میں بچپن کے دن، علی گڑھ کی نمائش کے قصّے اور لڑکوں کی شرارتیں، اُس کی باتوں میں بے پناہ روانی تھی اور انداز میں شگفتگی، اُسے چھوٹی چھوٹی باتوں میں مذاق کی تلاش رہتی، ہلکا پھلکا لطیفہ اس انداز سے بیان کرتی کہ ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں پانی آجاتا ۔

دن اور ہفتے کیسے گزر گئے کچھ یاد نہیں، باتیں ختم ہونے میں نہ آتیں، ساغنوں

کو پَر لگ جاتے اور گھڑی دیکھ کے ہم چونک اُٹھتے .... جانے وقت نے اُس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا ؟ گردشِ ایام نے اُسے پیس دیا یا اپنے دامن میں پناہ دی ؟ وہ لڑکی جس کے قہقہوں میں نقرئی گھنٹیاں بجتی تھیں کیا اب بھی محفل کو زعفران زار بنا رہی ہوگی ؟ گزرتے ہوئے لمحوں سے حظ اٹھانے کو فرانسیسی اچھوتی ترکیب یوادی ویور (JOIE-DE-VIVRE.) سے تعبیر کرتے ہیں، وہ والہانہ شوق جو ارزاں تعیّش تک محدود نہ ہو، جس میں انجانی جگہوں کا کھوج لگانا، اجنبی لوگوں کی حسیات جانچنا اور رنج و راحت کی تانوں میں اُن کے دلوں کی دھڑکن سُننا شامل ہو، جس میں ہم مشرب دوستوں کے ساتھ مجلس آرائی کو وہی اہمیت دی جائے جو نانی انسان دولت اور شہرت حاصل کرنے کو دیتا ہے تو یوادی ویور کی حس اُس میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔

لیکن مَیں متذبذب ہوگیا، دماغ نے دل کی ایک نہ سُنی "بہت شوخ و شنگ ہے" میں نے سوچا تھا "میرا ساتھ نہ دے سکے گی" وہ میرے رویّے سے مایوس سی ہوگئی۔ ایک رات اُن کے ہاں بُفے ڈنر تھا، وہ اپنی پلیٹ لے کر میرے پاس آگئی جس میں چکن روسٹ کا ٹکڑا تھا۔ "آیئے WISH BONE توڑیں"۔ میں نے WISH BONE توڑی تو اُس کے حصّے کچھ نہ آیا۔

میرے دامن میں نہ کلیاں ہیں نہ کانٹے نہ غبار

شمسہ نے آخری خط میں لکھا تھا: "یہ جو تم نے لکھا ہے کہ لوگ بُرائیاں یاد رکھتے ہیں اور اچھی باتیں طاقِ نسیاں کی زینت ہو جاتی ہیں تو تم میرے متعلق اچھی باتیں سوچنا اور میری خامیاں درگزر کر دینا .... خُدا کرے تمہیں اپنے ملک میں ایک محبّت کرنے والی بیوی نصیب ہو جو تمہیں سمجھ سکے، اللہ تمہیں پیارے پیارے بچّے عطا کرے اور تم ننّھی جانوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں کھو کے اپنا غم بھول سکو" جسے میں کھلنڈری سمجھتا تھا اُس نے کیسی پتے کی بات کہی تھی۔

انجانے رستوں پر چلتے چلتے ہم لمحہ دو لمحہ کے لیے ملتے ہیں، پھر اپنی اپنی ڈگر پر ہو لیتے ہیں اور وقت کا بے پناہ خلا ہمیں جذب کر لیتا ہے، کتنی عجیب بات ہے!

پکاڈلی سرکس میں گھومتے ہوئے لی زا سے اتفاقاً ملاقات ہوئی تھی "تم اپنے گروپ کے ساتھ ہمارا اسکول دیکھنے آئے تھے؟" جواب اثبات میں تھا، یہی ہماری دوستی کا پیش خیمہ تھا، انگلستان میں اجنبیت سے واقفیت اور واقفیت سے دوستی ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لی زا اپنے ڈھنگ کی انوکھی سی لڑکی تھی، اُسے مصوّری اور شاعری سے شغف تھا اور اسکول میں آرٹ پڑھاتی تھی، اُس کی باتوں میں بناوٹ نہیں تھی نہ ہی وہ اپنی کمزوریاں تسلیم کرنے میں تامّل کرتی۔ باتوں باتوں میں لی زا نے بتلایا تھا کہ اُس نے ایک بار ٹوٹ قسم کی محبّت کی تھی، وہ ایک بیلجین امیر زادہ تھا، لی زا نے دل پہ پتھّر رکھ کے ناطہ توڑا کیوں کہ بیلجیم کے اُمراء میں داشتہ رکھنے کا رواج تھا اور بیگمات پر پابندیاں عاید کر دی جاتی تھیں۔ لی زا کسی قیمت پر اپنی آزادی کھونے کے لیے تیار نہ تھی لیکن آہستہ آہستہ یہ راز کھُلا کہ قطع تعلق کی ابتدا دوسری جانب سے ہوئی اور پہلی محبّت میں ناکامی کے بعد وہ پھر سنبھل نہ سکی۔

برسٹل کے گرد و نواح میں سیر کرتے ہوئے ہم ایسی جگہ نکل آئے جہاں حدِّ نظر تک سبزہ ہی سبزہ تھا، پُرسکون وادی میں دریائے ایون بہہ رہا تھا، اُس پار سرسبز، گھنا جنگل خاموش تھا۔ لی زا نے دفعتاً پوچھا "تمہارے مُلک میں رشتے کیونکر طے پاتے ہیں؟"

مَیں جواب دے چکا تو اُس نے ناک بھوں چڑھائی، "بالکل عہدِ قدیم کے انسان کی مانند میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوں تو محبّت کیسے پروان چڑھ سکتی ہے؟ کیا زندگی جہنم نہیں بن جاتی؟ ایسی شادی کا انجام طلاق نہیں ہوتا؟ خدا کا شکر ہے کہ مَیں اپنی خوشی کی مالک ہوں، ماں باپ کا میری شادی میں دخل نہیں"۔ جب مَیں نے بتلایا کہ ایسے رشتے شاذ ہی ناکام ہوتے ہیں تو اُسے تعجب ہوا تھا۔ لی زا کی

نسبت ایک بار ٹوٹ چکی تھی، کورٹ شپ کے بعد اُسے احساس ہوا تھا کہ اُس کا 'دوست' ایک اچھا خاوند نہیں بن سکتا، دراصل وہ اپنے تمدن سے بیزار تھی۔ اُس نے کہا تھا، "تم لوگ خوش قسمت ہو، تمہارے ملک میں خلوص باقی ہے، تہذیب کے تہہ بہ تہہ غازے نے ہمارے جذبات کو ڈھانپ لیا ہے، بس نقالی رہ گئی ہے، ممکن ہے سو پچاس برس میں 'متمدن' ہو کر تم بھی ہم جیسے بن جاؤ!" سیرگاہ سے لوٹتے ہوئے لی زا نے شکوہ کیا ؎

نہ بہ بادہ میل داری نہ بہ من نظر کشائی
عجب ایں کہ تو ندانی رہ و رسم آشنائی
(اقبال)

"تم نے اپنے گرد ایک سنہرا طلسم تعمیر کر لیا ہے، خدارا کبھی زمین پر بھی آجاؤ جہاں چیزیں تشنۂ تکمیل سہی لیکن رفاقت تو ہے، کیا تمہاری تنہائی وحشت ناک نہیں"؟

پھر لی زا کی آنکھوں تلے سیاہ حلقے تیر گئے، ہر دم چہکنے والی لڑکی مغموم ہو گئی، اُس کو ایک آپریشن درپیش تھا جو جان لیوا ہو سکتا تھا۔ ایک دن اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "دُنیا میں چہل پہل ہے، رقص و سرود کی محفلیں ہیں لیکن موت میرا شکار کھیلنے پر مُصر ہے" اُسے ایک غمخوار کی ضرورت تھی، مجھے معلوم نہ تھا کہ بعض اوقات ہمدردی محبت سے زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے!

وقت گزرنے کے ساتھ لی زا کی شدید علالت اور تلوّن مزاجی نے مل کر ایک ناقابلِ فہم تضاد پیدا کر دیا تھا، اُس کی بیماری جذبۂ ترحم کو اُبھارتی اور تلوّن کی یاد غصّے کی لہر بیدار کرتی، عجب مخمصے میں جان تھی۔ میں نے کئی بار سوچا آغازِ جوانی کی محبت میں پاکیزگی تھی، مسلسل دُکھ سہنے سے تطہیرِ نفس کا احساس تھا، لیکن اب تو یوں تھا جیسے کوئی دلدل میں دھنستا چلا جائے جس سے کوئی مفر نہ ہو، انگلستان سے رخصت ہوتے وقت ایک عجیب انکشاف ہوا، لی زا کی بیماری لاعلاج تھی۔ ماں

اُنہاکی خود پسند تھی، اُسے ماں کی محبت کبھی نصیب نہ ہوئی، وہ اکلوتی بیٹی تھی لیکن ماں باپ اُس کے علاج کے اخراجات بھی برداشت نہیں کرتے تھے، اُسے منجدھار میں چھوڑ دیا گیا تھا، وہ اپنی بے بسی بھلانے کی کوشش نہ کرتی تو کیا کرتی ؟ کیا عجب کہ وہ نارمل نہ تھی !

انگلستان کی زندگی کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ تھیں لیکن سب سے اُجلی یاد اُسی لڑکی کی تھی جس نے زندگی اجیرن کر دی تھی۔ طبعاً لی زا مجھ سے اس حد تک مختلف تھی کہ ہماری ملاقات ہونی نہیں چاہیئے تھی لیکن ایسی بات تو ہم کوئی واقعہ ہو جانے کے بعد ہی سوچ سکتے ہیں۔

سوئٹزر لینڈ سے مَیں نے لی زا کے نام آخری خط لکھا "مَیں اور تم ایک جُداگانہ ماحول اور معاشرے کی پیداوار تھے، اس لیے جو کچھ ہوا ناگزیر تھا، اُس میں کسی کا دوش نہ تھا۔

جب منجمد کر دینے والی برفانی ہوائیں چلیں، جب لندن کی اُداس شامیں دُھند اور کُہر کی لپیٹ میں آجائیں اور ایک گراں بار احساسِ تنہائی رُوح پر چھا جائے تو یاد کرنا کہ پُرخلوص دوستی ایک قندیل کی مانند ہے۔ زندگی کے دشوار گزار راستوں اور تاریک لمحوں کو عبور کرتے ہوئے جب ہم اُس لَو کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں طمانیت ہوتی ہے کہ زندگی کی بے رحم کش مکش میں ہم تنہا نہیں بلکہ مقام و وقت کی سرحد کے پار دردمند دل ہمارے لیے دھڑکتے ہیں۔"

چند برس بعد مَیں نے ایک دوست کو جو گومگو کی حالت میں تھا لکھا تھا "شاید تم عورت کی ماہیّت کے متعلق بہت سوچتے ہو، کیا وہ آئیڈیل بیوی بن سکے گی؟ اُس نے پہلے کسی مرد کو تو نہیں چاہا ؟ اُس کا پیار شبنم آلود پھول کی مانند تر و تازہ رہے گا ؟ یا وہ اُن بیویوں میں سے ایک ہو کے رہ جائے گی جن کا مقصدِ حیات ایک اچھی روایتی

زندگی ہے، کیا اُس کی پرواز ایک اسمارٹ کار پر دم توڑ دے گی؟ میرے دوست تم بھُولتے ہو کہ زندگی خمار آگیں برستی شام ہی نہیں اور نہ گرم تنفّس کا لمس ہمیشہ جادو جگا سکتا ہے۔ بیوی تمہاری دوست ہے، دم ساز اور رفیق ہے۔ کب تک اُس کے بالوں میں آب دار موتی پروتے رہو گے۔

دارد جمالِ روئے تو امشب تماشائے دگر

کی کیفیت ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی، تمہیں جمالیات سے ماورا جانا ہوگا اور اُس اُکتا دینے والی یکسانیت کا مقابلہ کرنا ہوگا جس کا نام زندگی ہے، زندگی کی حلاوت سستے داموں نہیں ملتی، اگر تم آئیڈیل کی تلاش میں ہو تو اُسے ہونے والی بیوی میں نہ ڈھونڈنا، اگر پا بھی لوگے تو کچھ عرصہ بعد سوچو گے کہ دھوکا ہوا حالانکہ اُس میں وہ سب خوبیاں موجود تھیں جو تم نے چاہی تھیں، مسلسل رفاقت رُومان کا رنگ روغن لوٹ لیتی ہے۔

ایک پارٹی میں فرانس کے وزیرِ اعظم ماندے فرانس سے ایک خاتون نے پوچھا:

"موسیو آپ عمر بھر ناکتخدا رہے؟"

"مادام! میں ایک آئیڈیل خاتون کی تلاش میں سرگرداں رہا۔"

"پھر؟"

"بالآخر مجھے ایسی خاتون مل گئی۔"

"تو اُس سے شادی . . . ."

"جی وہ ایک آئیڈیل مرد کی تلاش میں تھی!"

زندگی تھکن سے بوجھل ہو چلی تھی۔ یوں تو زندگی خود ایک بار ہے لیکن ایسے دن بھی آئے کہ یہ گراں باری دردِ سر بن گئی۔ افسردہ شامیں طویل راتوں میں ڈھلنے لگیں، کبھی معمولی سانحے ٹریجڈی بن گئے۔ میری ہستی سیل کی زد میں رہی لیکن سیلاب آتے اور گزر جاتے، مہینے برسوں میں ڈھلتے رہے اور سال ایک غیر محسوس تسلسل کے ساتھ گزرتے

رہے، وقت کی رفتار کون روک سکا ہے ؟ پھر زندگی کے اُفق پر ایک تابناک ستارا طلوع ہوا، دو بڑی بڑی پُر محبّت آنکھوں نے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں "تم تو یونہی اُداس ہوگئے، محبّت کے سوتے ابھی خشک نہیں ہوئے"۔ میں نے پھر نظر اُٹھائی، اُس نے ایک اور رُوپ دھار لیا تھا" میں تمہارے بالکل قریب تھی، ذرا بھی کوشش کرتے تو مجھے پا لیتے"۔ اُس کی نظروں میں پیار کی گھلاوٹ تھی، اپنا زخم بھول کر میں اُس سنہری کرن کے تعاقب میں ہو لیا جو اُن مہربان آنکھوں میں جلوہ گر تھی —— زہرا چپکے سے میری زندگی میں داخل ہوگئی تھی۔

شادی کے اوّلین دن بھی خوب تھے، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم ایک دوسرے کو مدّت سے جانتے آئے ہوں، یہی وجہ تھی کہ پہاڑوں پر تازہ گری ہوئی برف دھوپ میں چمک اُٹھتی، دریائے سوات کا مسلسل نغمہ 'فردوسِ گوش' بن جاتا اور پتھریلے پُل سے شور مچاتی موجیں دعوتِ نظارہ دیتیں، ہم نے آغازِ بہار کی نرم اور مہربان دھوپ میں ساحل کے مخملیں کناروں پر جھاگ اُڑاتے ہوئے دریا کو دیکھا، کبھی چاندنی رات کے بیکراں حسن میں بہتے ہوئے دُور نکل گئے۔

مدّین کی وہ خوبصورت شام مجھے یاد ہے، کف در دہاں موجیں پتھروں سے ٹکرا کر ایک مترنّم شور پیدا کر رہی تھیں، ہم اپنے خیالوں میں مگن تھے کہ زہرا نے جھک کر دھیمے سُروں میں کہا" اگر میں نے تمہاری محبّت پالی تو مجھے سب کچھ مل گیا"۔ اُس کی آنکھوں میں خلوص کی چمک تھی اور آواز میں تھرتھراہٹ جیسے ستار پر شروع کے بول ہوں اور مجھے احساس ہوا کہ اُس نے کتنی عظیم بات کہہ دی ہے، کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ میری زندگی میں چند سال پیشتر آجاتی، کسی چور دروازے سے اَن دیکھے داخل ہو جاتی، مہک کی مانند، میں شبستان کے حریری پردے کھینچ دیتا اور ظلمتوں سے کہہ دیتا کہ یہاں اُن کا گزر ممکن نہیں۔

تا منزلِ جاناں ساتھ رہا کم بخت تصوّرِ غیبِ دِیں کا
شوق اپنا قدم کھینچا ہی کیا پلٹا ہی کیے ہر گام سے ہم
(شاد)

اُس تک پہنچنے کے لیے میرے قدم کئی بار ڈگمگائے، مَیں نے مُڑ مُڑ کے دیکھا کہ کہیں راستہ تو نہیں بھُول گیا، مجھے اُن پُراسرار گلیوں میں تو نہیں جانا تھا جو دائیں بائیں بکھری تھیں، اب جو سنہرے دھندلکوں کو پالیا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ عورت کی محبّت جیت لینے کے بعد کوئی ہوس باقی نہیں رہتی، ہم مطمئن ہو جاتے ہیں جیسے اُس بحرِ بیکراں کی تھاہ پالی جسے زندگی کہتے ہیں۔

میں نے ایک دفعہ زہرا کو لکھا تھا:

"تم بنتِ عم ہو جس نے محبّت کی اور اُسے دل میں دفن کر دیا، تم شمسہ ہو جسے میں نے "والکینو" کا خطاب دیا تھا۔ تمہاری وفا لی زا کی یاد دلاتی ہے جو اس لفظ سے نا آشنا تھی، تم سب کچھ ہو اور کچھ بھی نہیں کہ دُوئی کا حجاب درمیان سے اُٹھ چکا، تمہاری محبّت میں صہبا کی تُندی نہیں، آتش فشاں کی حدّت نہیں، تاروں بھری رات کی آسودگی ہے..........

جب ہم جسمانی لبادہ اُتار پھینکیں، بُوئے گُل محمل سے رہا ہو اور چشمِ بصیرت وا ہو جائے تو انسان دوستی کا وہ خواب یاد کرنا جو ہم نے اکٹھے دیکھا، اُن رفعتوں کو آواز دینا جو ہم نے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے طے کیں اور جن تک از خود پہنچنا ممکن نہ ہوتا۔"

بے شک رفتارِ وقت گزرتا رہا، میں گرد و پیش سے اثرات قبول کرتا رہا، رد کرتا رہا، کبھی تلخیوں کی جستجو ہوتی کبھی آسودگی اور بے طلبی کا احساس، زندگی کی تلخیوں کو میں نے اپنانا چاہا اور نہ اپنا سکا، ہر وہ شے جسے خوش قسمتی اور کامرانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مجھے عظیم جد و جہد کے بغیر ودیعت کر دی گئی، جو کسی کے لیے معراجِ کمال ہوتا میرے لیے گنجِ باد آورد تھا، ایک وقت آیا جب کائنات کے تحفے حقیر نظر آنے لگے اور نیلے آسمان کی وسعتیں

میری مٹھی میں آگئیں، یہ کبر نہ تھا کبریائی تھی، ایک انسان کا غرور جس کا ضمیر الوہیت سے گوندھا گیا تھا :

من آں روز بودم کہ اسما نبود
نشاں از وجودِ مُسمّا نبود
زِ ما شُد مُسمّا و اسما پدید
در آں روز کآنجا من و ما نبود
(رومی)

دل ایک لبریز پیالہ تھا جس میں مزید گنجائش نہ تھی، ایک قطرہ بھی ایزاد ہوتا تو ساغر چھلک جاتا، مجھے ان رفعتوں سے خوف آنے لگا، آرزو سے تہی دامنی تسکینِ قلب کا باعث نہ ہوئی، ہوتی بھی کیسے؟ کسی خلش کے بغیر زندگی بسر نہیں ہو سکتی ۔

عنفوانِ شباب میں ہر شے حسین معلوم ہوتی تھی، چاروں اور ممکنات کی دنیا تھی، اُس کے آدرش کو تجسیم بخشنا ممکن تھا، ایک تصور جو زندگی کو جلا بخشے، جس کی بدولت زندگی زندگی ہو، حیوانِ ناطق کا جینا نہ ہو، کچھ ایسی محبت مجھے تصورِ پاکستان کے ساتھ تھی، میرے مذہب میں کسی کے لیے نفرت نہ تھی لیکن اپنوں کی کس مپرسی اور بے بضاعتی سوہانِ رُوح تھی ۔ انہیں اپنا جائز مقام ملنا چاہیئے، تصورِ پاکستان کو بروئے کار لانے کے لیے جو تڑپ میرے ہم عمروں میں تھی وہ شاید ہی کسی اور طبقے میں ہو ۔ ہم لوگ زندگی کی دہلیز پہ تھے اور مستقبل سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار، ہم نے سرد و گرمِ زمانہ کے دو چار سال ہی دیکھے تھے، پاکستان ـــــ برِّصغیر کے مسلمانوں کی آماجگاہ! ہمیں ایک ایسا ملک بنانے کی لگن تھی جہاں حق و صداقت کا بول بالا ہو، ذات کا افتخار ہو نہ نسلی تنافر ۔ جہاں بھائی بھائی پر دشنہ تیز نہ کرے، جذبۂ ایثار مغائرت کی خلیج پاٹ دے خوش قسمت تھے وہ لوگ جو اُس آگ میں جل کر کندن ہوئے .... جو پود قیامِ پاکستان کے بعد پروان چڑھی ان مقاصد سے بے خبر رہی، انہوں نے اُس کش مکش کی آنچ نہ

محسوس کی۔ بہت ایسے بھی تھے کہ طوفان آیا اور گزر گیا، انہیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ابن الوقت زمانہ ساز لوگ، حکومت اپنی ہو یا پرائی انہیں اپنی چاندی کی فکر رہی۔

تقسیم ملک کے وقت کیا کیا آفتیں ڈھائی گئیں، خونیں فسادات، بہیمانہ مظالم، پنجاب کی سرزمین شہیدوں کے خون سے لالہ زار ہوئی، بٹوارے کے ناسُور رِس رہے تھے کہ کشمیر کا زخم کھایا، پھر فلسطین اور الجیریا کا اور دیش کے اندر باہر لاتعداد کچوکوں سے سینہ چھلنی ہوتا رہا، گرد و پیش عظیم شخصیتوں کے بُت ٹوٹتے رہے۔ انسانیت سر پیٹتی رہی، اپنے اندر جھانکتا تو کبھی بے غرضی اور لاتعلقی کا الاؤ روشن ہوتا، کبھی بے بس مکڑی کی طرح پایا اور لوبھ کے جال میں پھنس جاتا، کبھی مال و زر حلقہ بگوش غلام ہوتے، کبھی یہ خواہش کہ دھن دولت جمع کر لوں پھر محروم طبقہ کے لیے خوشی کے پھول یکسر بکھیر دوں گا۔ کیا طلبِ منفعت اور آدرش کے ڈانڈے کہیں ملتے ہیں یا تمام عمر انسان خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے؟

کچھ عرصہ ہوا میں یورپ سے لوٹ رہا تھا، مغرب کی حیرت انگیز ترقی دل پر نقش تھی۔ طیارے نے روم کے مطار سے پرواز کیا اور اگا تھا کرسٹی کی ایک فلم شروع ہو گئی۔ ہیروئین ایک قتل کا سراغ لگانے کے لیے تگ و دو کر رہی تھی۔ رات کا ایک بج رہا ہوگا کہ میں نے ناوانستہ طور پر باہر جھانکا، نیچے دھیمی رومانوی روشنیوں کا شہر آباد تھا۔ وسط میں ایک عظیم الشان عمارت بقعۂ نُور بنی تھی۔ اس کے اِرد گرد جگمگ جگمگ کرتے ہوئے گھروندے، یہ منظر لمحہ بہ لمحہ دُور ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا دل بیٹھ رہا تھا، کوندے کی طرح یہ خیال ذہن کے دریچوں کو منوّر کرتا ہوا گزر گیا کہ یہ سہانے سپنوں کا شہر تھا جس نے ہمیشہ چُھل دیا تھا۔ وہ سہانا خواب کیا ہوا جس میں ہم نے ایک جنّتِ ارضی بنانے کا عزم کیا تھا؟ جس سرزمین کی اساس اخوّت اور محبّت پر تھی وہاں سونے کے بچھڑے کی پُوجا ہوئی، ہل من مزید، ہل من مزید

کی صدائیں بلند ہوئیں اور خود غرضی ایک مسلک بن گئی، وہ قوسِ قزح کہاں تھی جس کی تلاش میں ہم نکلے تھے؟ "حریفانِ بزمِ عشق" کہاں رہ گئے جنہیں ہیچ رفیقِ سفر سمجھا تھا؟ جانے وہ کن گھاٹیوں میں بھٹک گئے؟ کون سی جل پریوں کے دامِ تزویر میں آ گئے؟ تو کیا نیچے بکھرے ہوئے تارے دسترس سے باہر تھے؟ طیارے میں تاریکی تھی، ہم سفر ائیرفون لگائے قاتل کی جستجو میں ہیروئن کے ساتھ ساتھ تھے۔ وہ پکچر میں مگن تھے اور میں اپنی دنیا میں، احساسِ محرومی پر سوتے ہوئے دھارے پھوٹ پڑے اور خوابیدہ حسرتیں بیدار ہوگئیں۔

پنہاں ملول بودن و تنہا گریستن

یہ آنسو اُن سپنوں کی نذر تھے جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے، اُس کرب کی نذر تھے جس کا مداوا ہمارے پاس تھا لیکن ہم نے تحمّل سے کام لیا، وہ سر جو قہرمانیوں کے سامنے خم نہ ہوا تھا آج جھک گیا تھا، وہ دل جسے دنیاوی نعمتیں مُسخّر نہ کرسکی تھیں آج رو رہا تھا... خاکِ وطن! میں قریہ قریہ گھوم آیا، موج موج ڈھونڈ چکا لیکن وہ بُو باس کہاں تھی جو تجھ میں ہے، وہ سوندھی خوشبو کہیں نہ تھی جو بہار کی بارش کے بعد دیس کی مٹی سے اُٹھتی ہے۔

رُوح کو بالیدگی بخشنے والی یادیں ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ تھیں، یوں بھی ہوا کہ انہیں آواز دینے سے کلفت دُھل گئی اور دل کا آئینہ صاف ہوگیا لیکن گزشتہ برسوں میں غبار کی دبیز تہہ چڑھ آئی تھی اور وجدان کے چشمے برابر خشک ہو رہے تھے، سڑک کے کنارے درختوں کے چہرے مٹی سے اَٹ جاتے ہیں، وہ سرما کی پہلی بارش کی راہ تکتے ہیں جو اُن کا منہ دُھلا سکے۔ دلِ ناداں باغِ وفا سے ایک جھونکے کا منتظر رہا

اے بادِ خوش کہ چمنِ دوست می وزی
برمن بوز کہ مژدۂ ریحانم آرزوست (رومی)

جانے وہ باغ کیوں خاموش تھا!

بمرورِ ایّام جوئے شیریں مکدّر ہوجاتی ہے۔ سہانے سپنے دُھندلا جاتے ہیں، پھر کوئی ستارا نہیں اُبھرتا، کوئی سورج طلوع نہیں ہوتا ....

دفعتاً اندھیری رات کے سنّاٹے میں سیناؤں کی چاپ سُنائی دی۔ نوکِ سنگین بیکسوں کا لہو چاٹ رہی تھی۔ حق کے نام پر گرم خُون بہہ رہا تھا، یکلخت زمانہ بدل گیا، زمین آسماں بدل گئے، جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے، توپوں کی گھن گرج دروازے تک آگئی، وفاشعار بیویوں کے خاوند، توتلی زبان والے بچّوں کے باپ، بہنوں کی آنکھ کے تارے گولیوں کی بوچھاڑ میں آگے ہی بڑھتے گئے، ارضِ پاک کی حُرمت پہ کٹ مرنے والوں کے سامنے غنیم کی بزن فوج بے بس تھی، لاہور را بجان برابر خریدہ ایم، نورجہاں کا یہ شعر پڑھ کر خیال گزرا تھا کہ صرف جان دینے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا، نورجہاں کے خواب کی تعبیر ساڑھے تین سو برس بعد پوری ہوئی۔

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم
جاں دادہ ایم و جنّتِ دیگر خریدہ ایم

اور اب سوچتا ہوں اشارہ کس طرف ہے، شہرِ جنّت نظیر لاہور یا شہداء کی جنّت! کارزارِ زیست میں سود و زیاں کی جنگ جاری ہے۔ یہاں موت سے سمجھوتہ کرلینا بڑی بات ہے۔

جب وارفتگی کے عالم میں ساری قوم نے ایک آواز پر لبیک کہا اور اپنی عزیز ترین متاع لٹانے کے لیے تیار ہوگئی تو میں نے سوچا یہ میری کتنی بھول تھی کہ میں تنہا ہوں۔ لذّتِ آشنائی چشیدہ اتنے ہم سفر میرے ساتھ ہی تو ہیں۔ ہاں رجز پڑھتے ہوئے میدانِ شہادت کی طرف بڑھنا سب کی قسمت میں نہیں ہوتا، اب خاکِ وطن کا ہر ذرّہ آفتاب تھا۔ سہاگنوں نے افشاں چن کر محبوبۂ وطن کی مانگ سنواری

سے بھر دی، پھر صدہا ستارے اُفق پر جلوہ گر ہوئے، اُس نور سے قاف تا قاف جگمگا اُٹھا تھا، یہ رُوح پرور نظارہ میری آنکھوں نے دیکھا لیکن میں اُن کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکا............. یہ کس نے کہا کوئی ستارا نہیں اُبھرتا، کوئی سورج طلوع نہیں ہوتا۔

۱۹۶۵ء

اے گلستانِ اندلس

اُندلس کی فضائیں اُداس ہیں، اُس کے در و بام پر ایک ناقابلِ بیان افسردگی سحر کی طرح مسلّط ہے۔ BROODING SADNESS کی وجہ لین پُول نے لکھی ہے "جب یورپ میں چار سُو ظلمت تھی عربوں نے علم و ادب کی شمعیں روشن کیں، شجاعت کے اصول وضع کیے، ہسپانویوں نے مورو[1] کو جلا وطن کر کے کیا پایا؟ کچھ عرصہ ہسپانیہ چاند کی طرح مستعار روشنی سے چمکتا رہا، پھر گرہن لگ گیا اور اُس وقت سے یہ مُلک تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے"۔

ابھی نور کا تڑکا تھا، گاڑی آہستہ آہستہ سیرا موریننہ کا سلسلۂ کوہ طے کر رہی تھی، تاریخ کے فیصلہ کُن موڑ پر یہ پہاڑیاں خون میں نہا گئی تھیں، اِس خون میں طوائف الملوکی اور دُودمان پرستی کی بے سُود قربانیاں بھی شامل تھیں۔ زائرانِ احساسات کے ساتھ قرطبہ کے نواحی علاقے میں پہنچتا ہے، انہی ویران پہاڑیوں پر عربوں نے AQUEDUCTS بنا کر سارا علاقہ شاداب کیا تھا۔ چاول، کپاس، نیشکر اور زیتون کی کاشت پہلی بار کی۔ انار، آڑو، بادام اور سنگترہ مقامی پھلوں پر اِیزاد کیے۔ اب یہ علاقہ زمین بُردگی کا شکار ہے، مٹی کے ٹیلوں میں گہرے شگاف نظر آ رہے ہیں۔

---

[1] رومن شمالی افریقہ کے باشندوں کو ماؤری یا اہلِ مغرب کہتے تھے۔ ہسپانوی میں یہ لفظ مورو ہوا اور انگریزی زبان میں مور، دراصل بربر مور تھے لیکن آہستہ آہستہ سب مسلمان جو ہسپانیہ میں بس گئے تھے مور کہلانے لگے۔

دیہی علاقوں میں لوگوں کے دن نہیں پھرے۔ پہاڑیوں سے چپکے ہوئے دیہات محرومی کی تصویر ہیں۔ گھر میں مٹی کا فرش، تن کے کپڑے، کم عمر میں شادی، کم عمر میں موت! سڑک کے کنارے ایک نوجوان نے سرگوشی کے انداز میں کہا: "ہماری غربت کی بڑی وجہ اہلِ کلیسا اور زمینداروں کا گٹھ جوڑ ہے۔ بڑے زمیندار نہیں چاہتے کہ علم کی روشنی عام ہو، کبھی سنو کہ اس حصّے میں کسانوں نے بغاوت کر دی ہے تو حیران نہ ہونا!"

عربوں کے آنے سے پہلے بھی غریب کسان جاگیرداروں اور پادریوں کے رحم و کرم پر تھے اور ایک ہزار برس بعد بھی! کیا گزشتہ پانچ سو برس ترقیِ معکوس کی نذر ہوئے؟ عرب حکمرانوں نے کاشت کار کو اراضی اور آب رسانی کے حقوق دیئے۔ یوں ملک کی خوش حالی میں اُسے حصّہ ملا تھا۔ شکست سے پہلے یہ عافیت خانہ جنگیوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔

بدنظمی کے مختصر وقفے کے سوا اڑھائی سو برس قرطبہ مغرب کا عظیم ترین شہر رہا۔ اس کے کمالِ عروج کا زمانہ دسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ صاف پانی بکثرت مہیا کیا گیا تھا۔ معبدوں کے طلائی گنبد اور خوشنما باغات دُور سے نظر آتے تھے۔ آئندہ دو سو برس تک یورپ میں کوئی شہر نہ تھا جہاں گلی کوچوں میں سنگی فرش ہو، نہ ہی اسکول یا پبلک حمام ایسی نعمتوں کا خیال کیا جا سکتا تھا۔

قرطبہ میں ستّر لائبریریاں اور بے شمار کتابوں کی دکانیں تھیں۔ کاغذ سازی کا فن مراکو اور ہسپانیہ نے عربوں سے سیکھا جہاں سے وہ یورپ تک پہنچا۔ لکھائی کے لیے عرب کاغذ کی بہترین قسم استعمال کرتے تھے۔ جامعہ قرطبہ نظامیہ بغداد اور الازہر کی پیشرو تھی۔ قرطبہ کے عظیم فرزند ابنِ رُشد نے ارسطو کی شرح لکھی اور اُس کے بہت سے نظریات کو رد کیا۔ مدّت تک ابنِ رُشد کے افکار نے یورپ کے فلسفیوں کو متاثر کیا۔ اُندلس میں ابتدائی تعلیم عام تھی۔ یورپ میں جہالت کا دور دورہ تھا۔ راہبوں یا پادریوں کے علاوہ لوگ مروجہ علوم سے بے بہرہ تھے۔

قدیم شہر کا محیط چودہ میل تھا۔ وادی الحسن، جنان العجوبہ ایسے دل کشا مضافات دریا کے کنارے پر پھیلے تھے۔ کوچوں میں پتھر کا فرش اس نفاست سے بچھا تھا کہ آج بھی لکڑی کے پہیوں والی گاڑی شور مچاتی اُن گول پتھروں پر سے گزرتی ہے جو ایک ہزار برس پہلے عربوں نے ترتیب سے جوڑے تھے۔ دیدہ زیب پُل دریا کے دونوں کناروں کو ملاتے تھے۔ سب سے بڑا پُل اب بھی وادالکبیر کی حدِ سیلاب سے بلند، دعوتِ فکر دیتا ہے۔

قرطبہ نسبتاً چھوٹا شہر ہے لیکن وضع قطع کے لحاظ سے اُس میں ایک جاذبیت ہے، اُمرا کے مکانات جیسے مشرقی طرز کی ڈیوڑھی دار حویلیاں، اندر سنگِ مرمر کا صحن اور فوارہ، ارد گرد بیل بُوٹے، باہر صیقل شدہ جنگلہ، مکان مکینوں کی خوش ذوقی اور نفاستِ طبع کا پتہ دیتے ہیں۔ ایک چوک سے دوسرے چوک تک عرب کوچوں کے پیچ و خم، فواروں سے آراستہ چھوٹے چھوٹے دلآویز چوک، فضا میں شگوفوں کی مہک تھی، گھروں اور کوچے کے درمیان گلاب اور حنا کے چمن تھے۔ پھُول دار بیلیں دومنزلہ مکانوں پر چڑھ گئی تھیں۔ منظر کی رنگینی میں کچھ کمی تھی تو وہ پھُولوں سے لدی پھندی ٹوکریوں نے پوری کر دی جو شہ نشینوں میں لٹک رہی تھیں۔

قرطبہ کے بھرے بازاروں میں سیاہ فام حبشی، گندمی رنگ بربر، عرب علماء اور اُمراء ملکوں ملکوں کے تجّار، شاہی محلوں کے پاسبان اور عقب میں کاریگر اور مزدور قافلہ بن کر گزر گئے۔ آج سوادِ شہر میں بگولے اُٹھتے ہیں جیسے شوکتِ پارینہ کا ماتم کر رہے ہوں۔

مسجد اس 'عروس البلاد' کا دل تھی، اندر قدم دھرتے ہی اُس کی عظمت کا نقش دل پہ ثبت ہو جاتا ہے۔ لاتعداد ستون اور محراب حجم اور پائیداری کا ٹھوس تاثر دیتے ہیں۔ اُن کے حسنِ ترتیب سے مسجد کی دلکشی دوبالا ہو جاتی ہے۔ وُسعت کا تقاضا تھا کہ مسجد بلند بام ہو۔ اُونچی چھت اور ستونوں کی کثرت سے بے پایاں کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ مسجد کی خوبصورتی اُس کی سادگی اور پہنائی میں نہاں ہے۔ اطراف میں نظر بے محابا دوڑتی

ہے ۔ سنگِ یشب ، سنگِ موسیٰ اور سنگِ سُرخ کے ستونوں کی طویل روشیں ، ملگجے سایوں میں کھو جاتی ہیں ، چارسُو ایک حسین جھٹپٹا ہے ۔ انجانے گوشوں سے چھنتی ہوئی روشنی منظر کو لطیف نورانی چادر اوڑھا دیتی ہے ۔ ستونوں سے اُبھرتی ہوئی دوہری محرابیں چھت کو سہارا دیئے ہیں ، محرابوں پر قرمزی اور پیلی دھاریوں کی وہ فراوانی ہے کہ نظر اُچٹتی چلی جاتی ہے اور ایک نکتے پہ ٹھہرنے نہیں پاتی ۔ اس سے عمق کا دلکش تاثر ملتا ہے ۔ چارسو ستون گرا کر شمالاً جنوباً کلیسا بنا دیئے گئے ہیں لیکن کلیساؤں کی بے جا مداخلت بھی اُس طلسم کو نہیں توڑ سکی جو بیکراں فراخی سے پیدا ہوتا ہے ۔

مسجد کی وجاہت لازوال ہے ۔ انسان اندرونی حصّے کی زیبائی دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہے ۔ امتدادِ وقت نے بہت سے نقش و نگار مٹا ڈالے ۔ دولتِ قرطبہ برباد ہوئی تو زبرجد کے ستون اور چاندی کے جھاڑ گرجوں کی زینت ہوئے ۔ آبنوس اور ہاتھی دانت کا بنا ہوا بیش بہا منبر پارہ پارہ کر دیا گیا لیکن پتھر میں ترشے ہوئے ڈیزائن اور شیشے کی پھول پتیاں پرانی آب و تاب کی یاد دلاتی ہیں ۔

ہسپانیہ میں اموی سلطنت کے بانی عبدالرحمٰن اوّل نے آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ مسجد تعمیر کی ۔ المنصور اور دیگر حکمرانوں نے گراں قدر اضافے کیے ۔ رمضان کی راتوں میں مسجد اسلام کی عظمت کا مظہر ہوتی ۔ پیتل کے شمعدانوں میں اَن گنت بتیاں جگمگاتیں ، حق کے متوالوں سے صحن اور دالان پُر ہوتے ۔ تسبیح و تراویح کے ترنّم اور عنبر کی خوشبو سے فضا مہک اُٹھتی ۔

نصرانی ہونے کے باوجود اہلِ قرطبہ نے کلیسا بنانے کی مخالفت کی تھی ۔ وہ آخر دم تک کہتے رہے کہ کلیسا کی تعمیر سے مسجد کی خوبصورتی تباہ ہو جائے گی لیکن آرچ بشپ نے اُن کے خلاف فیصلہ دیا ۔ دو برس بعد آرچ بشپ وہاں سے گزرا تو اُسے پہلی مرتبہ مسجد دیکھنے کا اتفاق ہوا ، اپنے کیے پہ متاسّف ہوا اور اُس نے کہا " اگر مجھے معلوم ہوتا

مسجد اتنی جمیل ہے ، تو کبھی کلیسا کی تعمیر کا حکم نہ دیتا" یہ روایت قرطبہ کے میونسپل ہال میں ایک دستاویز کی شکل میں محفوظ ہے ۔ ہمارے راہبر نے کہا "مسجد کے بیچ کلیساؤں کی تعمیر افسوسناک ہے لیکن مجھے یہ سوچ کر اک گونہ تسلّی ہوتی ہے کہ اگر یہ کلیسا نہ ہوتے تو شاید اس مسجد کا بھی وہی حشر ہوتا جو قرطبہ میں چھ سو مساجد اور سات سو حماموں کا ہوا ، یعنی ڈھونڈے سے بھی اِس کا نشان نہ ملتا ۔"

حاکمِ وقت ابن ابی عامر المنصور نے مسجد کی توسیع کی تو عام مزدور کی طرح ٹوکری ڈھوئی اور کدال لے کر کھدائی کی ۔ المنصور جس نے بے شمار جنگیں لڑیں لیکن کبھی شکست نہیں کھائی ۔ جو شوقِ شہادت میں ہر جنگ میں کفن ساتھ رکھتا تھا ۔ چشمِ تصوّر نے دیکھا کہ عمامہ باندھے عربی شہسوار اپنی آرام گاہوں سے نکل کر کہہ رہے ہیں " باری تعالیٰ ! تو نے اپنے دیوانوں کو دیکھا ، جہاں ایک ستون ہوتا ہم نے دس نصب کیے ، درازقامت مجلّا ستون قطار اندر قطار اور اُن پہ سایہ افگن محرابوں کے خیاباں ، تیرے عشق میں ہر مشقّت راحت تھی ، تیرے نام لیوا کب کے ختم ہو چکے لیکن در و دیوار پر سونے کے جلی حروف آج بھی حمد و ثنا کر رہے ہیں ؎

شعلہ بودیم شکستیم و شرر گردیدیم
صاحبِ ذوق و تمنّا و نظر گردیدیم (اقبال)

اقبالؔ کی طویل نظم 'مسجدِ قرطبہ' اسی ذوق و شوق کی آئینہ دار ہے ۔ 'اندلسی نظموں' میں اقبالؔ کھوئے ہوؤں کی جستجو میں نکلتے ہیں ۔ راہِ محبّت کا یہ راہرو اہلِ صفا کی تلاش میں سرگرم سفر ہوتا ہے ۔ پڑھنے والے پر ایک اضطراری کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ یہی جذبہ اس سرزمین میں کشاں کشاں لے آیا تھا ۔ اقبال کی نظر میں سلسلۂ روز و شب ہی اصلِ حیات و ممات ہے ۔

من حیاتم من مماتم من نشور
من حساب و دوزخ و فردوس و حور

روز و شب کا لامتناہی سلسلہ تُندرو میں ڈھل کر درپئے تخریب ہوتا ہے۔ اس کے سامنے سعیِ انسان ہیچ ہے لیکن عمل کی پرکھ بھی اسی سے ہے۔ حق و باطل، خوب و ناخوب کی پرکھ؛ زرِ کم عیار رد کر دیا جاتا ہے۔ جریدۂ عشق پر مہرِ دوام ثبت ہوتی ہے۔ معجزہ ہائے ہنر ہوں یا نقشِ کہن و نو سب كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کی زد میں ہیں۔ پھر اقبال منفی سے مثبت کی طرف لوٹتے ہیں۔ وہ ایسے فن پارے کو لازوال ہونے کی بشارت دیتے ہیں جس کی اساس عشق پر ہو۔ عشق وقت کے تصادم و تلاطم کے خلاف ڈھال ہے۔ وقت کا بیرحم ریلا گزر چکا، مسجد کا جاہ و جلال پائندہ ہے۔

زندگی کا دھارا پیہم رواں دواں ہر دم رواں ہے لیکن من حیث زمان و مکاں، زمان و کی کوئی وقعت نہیں، یہ محض خودی کے مظاہر ہیں۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَانٍ (سورہ الرحمٰن)

وہ (باری تعالیٰ) ہر لحظہ ایک نئی شان میں ہوتا ہے

زنجیرِ ایّام سے یہی دکھلانا مقصود تھا۔

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

ناتمام کائنات بتدریج ارتقا کی منازل طے کر رہی ہے۔ تخلیقی مقاصد کے حصول میں بندۂ مولا صفات خالقِ حقیقی کا ممد و معاون ہے۔ عظیم کاموں کی انجام دہی میں اُس کی شخصیت 'ذات' کے ساتھ متصل ہوتی ہے۔ جب تک کائنات اور انسانیت معراجِ کمال تک نہیں پہنچتیں مومن کی تگ و دَو ختم نہیں ہوگی۔

اقبال نے مسجد کو کسی مادی چیز سے تشبیہہ نہیں دی۔ اُن کے نزدیک وہ ایسی مناسبت سے ماوراء ہے۔ عظمِ مسجد کے جلال و جمال میں اقبال کو مردِ خدا کے خدوخال نظر آئے۔ حسُن میں مسجد قلبِ مسلمان سے مشابہ ہے...... قلبِ مسلماں جو انوارِ ذات کی جلوہ گاہ

ہے جو حق پرستوں کے لیے شبنم ہے لیکن باطل کے خلاف ازل سے برسرِ پیکار

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (سورہ الواقعۃ)

وہ کفّار کے حق میں بہت سخت ہیں لیکن آپس میں رحم دل

مسجد کی رفاقت میں شاعر کو یکسوئی حاصل ہوئی۔ فضاؤں میں ایک غیر مرئی پاکیزگی اور آسودگی تھی۔ یکایک نہاں خانۂ دل نغمے کی جھنکار سے گونج اُٹھا۔ زمین و آسماں منّور ہو گئے۔

تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نُور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل

تاریخ کے گم گشتہ اوراق نظر کے سامنے تھے۔ اقبالؔ نے اُن مجاہدوں کو پکارا جو اُندلس میں فاتح بن کے آئے لیکن عالی ظرفی، رواداری اور شائستگی میں نئی اقدار کے نقیب تھے۔ اُسے اُن صحرانشینوں کی یاد نے ستایا جو خبر اور نظر میں ہم آہنگ تھے۔ جن کے لیے اذانِ سحر کیف و مستی کا پیام لاتی تھی۔

ساقی بہ صبوحی نفسی پیشتر از صُبح
برخیز کہ تا صُبح شُدن تاب ندارم
(قدسی)

جبینِ نیاز میں تڑپتے ہوئے سجدے خاک میں رُوپوش ہو گئے۔ مسیحا نفس اذانیں بادِ سحر میں تحلیل ہو گئیں۔ پھر زمان و مکان کے فاصلے شاعر کے دل میں سمٹ آئے۔ وقت، شاعر اور ابدیت کی تثلیث، وقت اور ابد کے درمیان مسجدِ قرطبہ نقطۂ ارتکاز تھی۔ نکبتِ ادبار کی صبر آزما صدیاں ایک لمحے میں مرتکز ہو کے رہ گئیں۔ القا کے فیضان سے مقام و وقت کی سرحدیں معدوم ہو گئیں۔ دنیاوی بندھنوں کی گرفت سے آزاد ہو کر شاعر کو وہ لمحہ منزّہ میسّر آیا جس میں ماضی، حال اور مستقبل ایک وحدت میں ضم ہوتے ہیں۔ ایسے

میں کہے گئے کلام کی آفاق گیر پہنائی اُس کے لازوال ہونے کی ضمانت تھی۔ وجدانی لمحات میں اِک دُکھیا رُوح نے وہ رفعتیں چھُو لیں جن تک از خود پہنچنا ممکن نہ ہوتا۔

وہ خیالِ عظیم جس کی گونج رہتی دنیا تک سنائی دے کس طور رُوح کی گہرائیوں میں جنم لیتا ہے۔ الہامی کیفیات کے نزول سے پہلے شعور و لاشعور کی دنیا میں رُوح نے مدّتوں دُکھ جھیلے ہوں گے، برسوں کرب سہا ہوگا

جوہرِ اندیشہ دل خُون گشتنی در کار داشت
(غالبؔ)

بالآخر ضبط کے بند ٹوٹ گئے اور درد کا لاوا بہہ نکلا۔ اُس دل فروز فضا میں اک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک بلند ہوئی۔ اِک کافرِ ہندی کی صدا جس کے رگ و پے میں نغمہ اللہ ہُو شعلہ زن تھا۔

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں — آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کونسی وادی میں ہے کونسی منزل میں ہے — عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

کیا یہ حرم مرتبت سجدہ گاہ ہمیشہ بے اذاں رہے گی؟ عاشقانِ دردمند کا قافلہ کہاں بھٹک گیا؟ میرے اللہ میں اُسے کہاں ڈھونڈوں؟

بگوشم می رسد از دُور آوازِ درا امشب
دل گُم گشتۂ دارم کہ در صحراست پنداری
(غالبؔ)

شاعرِ مشرق شاعرِ اُمّید بھی ہیں۔ خُون صد ہزار انجم سے سحر پیدا ہونے کی نوید دینے والے نے کنارِ کبیرِ عالمِ نو کو بے نقاب دیکھا اور رُوحِ مسلماں میں اضطراب کو نیک شگون جانا لیکن فخر سے سر اُونچا کر کے

در جہاں بانگِ اذاں بُود است و ہست
ملّتِ اسلامیاں بُود است و ہست

کہنے والا بے چراغ مسجد دیکھ کے تڑپ اُٹھا۔ ایک لمحے کے لیے رجائیت بادل کی

اوٹ میں آگئی

آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

اسے نیرنگیِ زمانہ کہہ لیجئے لیکن دنیا بھر میں ہسپانیہ ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں صدیوں اذاں کی صدا بلند ہوئی لیکن جہاں آج ایک کلمہ گو بھی باقی نہیں!

سلطان سعود ہسپانیہ کا سرکاری دورہ کر رہے تھے۔ وہ اپنی جماعت کے ساتھ مسجدِ قرطبہ میں داخل ہوئے تو نماز کا وقت آ گیا۔ سلطان نے نماز ادا کرنے کے لیے پروٹوکول کے افسران سے اجازت چاہی، انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ مسجد کلیسا میں تبدیل ہو چکی ہے۔ سلطان کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ اُنہوں نے کہا "میں اُس رسول ؐ کی اُمت سے ہوں جس نے نصرانیوں کے وفد کو مسجدِ نبوی میں عبادت کرنے کی اجازت دی اور تم مجھے اپنی مسجد میں نماز ادا کرنے سے روکتے ہو؟" سلطان نے ایک مصاحب کو اِذنِ اذاں دیا اور یُوں سات صدیوں بعد مسجد کی خاموش فضاؤں میں اذاں کی صدا گونجی۔

مدینۃ الزہرا کے بغیر قرطبہ کی داستان تشنہ رہے گی۔ خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے اپنی محبوبہ زہرا کی یاد میں قرطبہ سے تین میل اس سوادِ یگانہ کی بنیاد رکھی۔ رنگیں مرمر دنیا کے مختلف حصّوں سے لایا گیا۔ سلاطینِ قسطنطنیہ اور روم نے ستونوں کے تحائف بھیجے۔ آبنوس افریقہ سے، خوشبودار لکڑی مشرق سے، سونے کے جانور، مطلّا بال کمرے، سالم سنگِ سماق سے تراشا ہوا پارے سے لبریز حوض، اپنے عروج پر قصرِ زہرا دنیا کے نوادر سے بھرپور تھا۔ یہیں سفیر باریاب ہوتے اور خلیفہ صوبائی حکام کی رپورٹیں سنتے۔

شہر تین مدارج پر بنا تھا۔ شاہی محل بلندی پر تھا، اُس کے قرب وجوار میں اُمرا کی رہائش گاہیں تھیں، نچلے درجے میں چمن اور باغات تھے اور زیریں حصّے میں دفاتر اور شاگرد پیشہ۔ دارالحکومت کے لیے شہری منصوبہ بندی کا شاید یہ پہلا منصوبہ تھا۔ یوں یہ شہر کینبرا اور برازیلا کا پیشرو تھا۔ مدینۃ الزہرا کی زندگی مختصر تھی، اس کی تکمیل چالیس برس میں ہوئی۔ پچاس برس بعد یہ مشققت

'فتنہ' کی نظر ہو گئی۔ اس دُلہن کا سہاگ بربروں کے ہاتھوں لٹا تھا۔ تہذیب و تمدّن سے ناآشنا افریقی سپاہی ایک سیلاب کی طرح اس حسین مرقّع پر ٹوٹ پڑے اور وحشیانہ تنفّر کے ساتھ آرائش و زیبائش کی دھجّیاں اُڑا دیں۔ پھر اس لُٹے ہوئے شہر کو دیا سلائی دکھلا دی۔ آج مختلف سطحوں پر گھاس کے تین قطعے باقی ہیں۔ اللہ بس باقی ہوس!

کئی سو برس بعد تک جھیلیں اور باغات باقی تھے۔ شاعر ابن زیدون شہزادی ولیدہ کو وہ خوش گوار لمحات یاد دلاتا ہے جو اُس کی صحبت میں بسر ہوئے جب عالمِ خیال میں انہوں نے اُجڑے ہوئے قصر پھر سے تعمیر کیے تھے۔

یادِ ایّامیکہ با او گفتگو ہا داشتم
اے خوشا حرفے کہ گوید آشنا با آشنا
(گرامی)

موحدین کی شہزادی ولیدہ حسن و جمال کے علاوہ شاعری میں یکتا تھی۔ مشہور شاعر ابنِ زیدون کو محبّت کرنے کی پاداش میں جلاوطن ہونا پڑا تھا۔

زیرِ زمین 'گنج ہائے گراں مایہ' صدیوں تعصّب اور غفلت کا شکار رہے۔ کھنڈرات اب پیہم ظاہر ہو رہے ہیں، فرینکو کا محکمۂ آثارِ قدیمہ ٹکڑوں اور ٹھیکریوں کی لمبی قطاریں لگائے ہوئے تھا۔ یہ توقع عبث ہے کہ ہسپانوی قصرِ زہرا کو اصلی حالت پہ لا سکیں گے۔ آج کل کے صنّاع ویسے منقش ستون یا ظروف تک بنانے سے قاصر ہیں، اسی لیے وہاں ایک عجائب خانہ بنانے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

اشبیلیہ، اُندلس کی رُوحِ معطّر، یمنی امیروں کا مغرور دارالسلطنت جہاں فضا یاسمین اور گلاب سے مہکی ہوئی ہے۔ سنہری مچھلیاں خواب آلود محل کے شفّاف چشموں میں اُبھرتی ہیں۔ 'القصر' کا ایوان السفیر شوکتِ رفتہ کا راز داں ہے۔ وہاں گھومتے ہوئے ایک ہسپانوی نے شکوہ کیا۔ خلیفہ حرم میں لاتعداد بیویاں باندیاں رکھتے تھے، رنگ رلیاں مناتے تھے اور بے چاری عیسائی رعایا ٹیکس ادا کرتی تھی۔ بھائی سچ ہے لیکن شمال میں عیسائی حکومتوں کے

حالات کون سے بہتر تھے ۔ آج بھی اک مجہول معاشرے کے طفیل حُسن سرِ بازار نیلام ہوتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ اقتدار نے دوسرے رُوپ دھار لیے ہیں ۔ اشبیلیہ میں آسودگی ہے مسکراہٹیں ہیں ۔ شام کو پلازا میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے لیکن مجھے ایک زرّیں عہد کی یاد یہاں لے آئی تھی ۔

یہ ٹریجک ہیرو، معتمد کا اشبیلیہ ہے ، میدانِ جنگ کو روانہ ہونے سے پیشتر وہ القصر کے وسیع میدان میں فوج کا معائنہ کرتا تھا، تلواروں کی خیرہ کن چمک میں عسکری پھریرے لہراتے ، عربی النسل گھوڑے آقاؤں کے منتظر ہوتے ، ڈھول بجتے ، لوگوں کو روتا چھوڑ کر فوج روانہ ہو جاتی ۔ شمشیر زن معتمد ! جنگِ زلّاقہ میں اُس کی ران تلے تین گھوڑے کام آئے، زرہ بکتر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے لیکن جو سامنے آیا زیر ہوا ۔

گردوپیش شکست و ریخت کا سلسلہ جاری تھا ۔ تاریخ کے اس المناک موڑ پر، پیش آنے والی تحقیر و تذلیل سے بے خبر، معتمد اُس عظیم الشان تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے جو کسی طور ہارون الرشید کے بغداد سے کم نہ تھی ۔ علم دوست، علم پرور معتمد ! عرب ہسپانیہ کا عظیم ترین شاعر جو بیک وقت حکومت، عشق اور شاعری کر سکتا تھا

ساقیِ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اُس کا رحیق، تیغ ہے اُس کی اصیل
(اقبال)

سیاست دانوں اور سپہ سالاروں کی بجائے معتمد کو شعرا اور موسیقاروں کی صحبت مرغوب تھی ۔ ایک روز وہ اپنے شاعر دوست ابنِ عمار کے ساتھ کنارِ دریا ٹہل رہا تھا، شعر گوئی ہو رہی تھی ۔ معتمد نے ایک مصرع کہا، پیشتر اس کے کہ ابنِ عمار جوابی مصرع کہتا کپڑے دھوتے ہوئے ایک حسین کنیز نے برجستہ مصرع کہہ دیا ۔ اس ادا پہ فریفتہ ہو کر بادشاہ نے اُسے اپنے عقد میں لے لیا ۔ شاہی محلوں میں رومیکیہ کے قہقہے گونجتے رہے ۔ معتمد کی راتیں اُس کی رعنائیوں سے روشن تھیں ۔ رومیکیہ نے جلا وطنی میں معتمد کا ساتھ دیا اور مراکش

سے کے قریب اُس کے پہلو میں دفن ہے۔

مسلم ہسپانیہ میں گیارہویں صدی عیسوی طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ اُندلس تیئس طائفوں میں بٹ گیا تھا جو باہمی آویزش اور اندرونی خلفشار کا شکار تھے۔ اِس پُرآشوب زمانے میں بھی اہلِ علم کا شغف کم نہیں ہوا تھا۔ بادشاہ کا محل ہو یا غریب کی کُٹیا ہر جگہ شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ ستاروں کے اِس جُھرمٹ میں اشبیلیہ درخشندہ ترین ستارا تھا۔ افسوس شعر و سخن کی جنیں بہارِ دولتِ مستعجل تھی۔ جب پے بہ پے یورش کر کے نصرانی حکمران مسلمانوں کا جینا دوبھر کر رہے تھے۔ اقصائے مغرب میں ایک تابناک ستارا اُبھرا۔ شمال مغربی افریقہ کا فرمانروا اور عظیم فاتح یوسف بن تاشفین جسے ہسپانیہ میں ملّتِ اسلامیہ کا محافظ ہونا تھا، جس نے دُور افتادہ صحراؤں سے تازہ دم بربروں کو منظّم فوج کے سانچے میں ڈھالا۔ یوسف بن تاشفین معتمد کے بلوانے پر مراکش سے آیا کہ عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے سَیل کو روکے۔ جنگِ زلّاقہ میں الفانسو نے منہ کی کھائی لیکن مسلمان حکمران آپس میں دست بگریباں رہے اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے نصرانی حکومتوں سے ساز باز کرتے رہے۔ جب نصرانی فوج کے ہاتھوں خواتین کی عصمت محفوظ نہ رہی اور مسلمان غلام ہو کر بکنے لگے تو یوسف بن تاشفین نے اسلامی حکومت کی حفاظت کے لیے ہسپانیہ کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ معتمد جس نے عیسائیوں کا آلۂ کار بننے کی بجائے مسلمانوں کی محکومی کو ترجیح دی تھی جس نے قشتالیہ میں سؤروں کی نگہداشت کی بجائے افریقہ میں اونٹوں کا چرواہا بننا پسند کیا تھا آخر حرص و آز کے دام میں آگیا اور اپنا تخت بچانے کے لیے الفانسو سے مدد کا طالب ہوا۔ یوسف بن تاشفین کے نائب ابوبکر نے اشبیلیہ کا محاصرہ کر لیا۔ معتمد مردانہ وار لڑا لیکن تقدیر کا فیصلہ اٹل تھا شکست کھا کر قید ہوا

مردِ حُر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج

معتمد ابن اللبانہ کا مربی تھا۔ قیدی کی حیثیت سے اُس کی اشبیلیہ سے روانگی کا

دردناک منظر ابن اللبّانہ نے نظم کیا ہے :

سب باتیں یاد سے محو ہو جائیں گی
لیکن آہ ! وادالکبیر کے کنارے وہ قیامت خیز صبح
اسیر جہازوں میں یوں دبکے تھے جیسے مُردے اپنی قبروں میں
دونوں کناروں پر لوگوں کا ہجوم تھا
وہ دیکھ رہے تھے کہ آبدار موتی دریا کی جھاگ پر کیسے تیرتے ہیں !
دوشیزاؤں نے نقابیں اُلٹ دیں، چہرے ڈھانپنے کی ضرورت نہ تھی
چہرے نوچ لیے گئے جیسے کہنہ عبا تار تار ہو جائے
وہ جانکاہ لمحہ آن پہنچا، الوداع کہنے والوں کا شور
کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی
نالہ وشیون میں نازک اندام حسین اور تنومند بہادر برابر تھے
آہیں اور ہچکیاں جہازوں کی ہمسفر ہوئیں
جیسے ساربان سست کارواں کو حُدی خوانی کی مہمیز دے
آہ کتنے آنسو دریا کی نظر ہوئے
چپّو چلانے والے غلام
کتنے شکستہ دل اپنے ساتھ لے گئے
اور انہیں خبر تک نہ ہوئی !

معتمد جو فی البدیہہ مصرع چُست کرنے پر ایک کنیز پر عاشق ہو گیا تھا جس نے قصیدہ کہنے پر ایک شاعر کو ایک ہزار دینار دیئے تھے مراکش کے قریب اغمات میں مقیّد رہا۔ پابجولاں اور نادار، اُس کے آخری ایّام بہت تلخ تھے۔ اُس کی نازو نعمت میں پلی ہوئی بیٹیاں گزارے کے لیے سُوت کاتتی تھیں۔ اُن دنوں ایک مقامی شاعر حصری نے اس کی تعریف میں چند اشعار

لکھ بھیجے۔ معتمد نے اُسے چاندی کے پنتیس سکّے بھجوا دیئے اور تحفے کی کم مائیگی کے لیے معذرت چاہی۔ یہ آخری پُونجی تھی جو جلا وطن ہوتے وقت وہ اپنے خون آلود موزے میں چھپا لایا تھا۔ معتمد کی بہترین نظمیں جلا وطنی میں لکھی گیئں، وہ آخر دم تک شعر کہتا رہا۔ اُس کے یہ اشعار کتبۂ مزار ہو سکتے تھے ۔

آہ وہ سہانا خواب!
کہ شباب کی تیغِ آبدار کبھی زنگ آلود نہ ہوگی
ہم نے سراب سے چشمہ مانگا، ریت سے گلاب کی تمنّا کی
زندگی کے معمّے لاینحل رہیں گے اور
بالآخر خردِ خاک کا بستر بنائے گی

غرناطہ جاتے ہوئے گاڑی میں ایک فربہ اندام ہسپانوی خاتون رات بھر باتیں کرتی رہی، نیند کا جھونکا آتا لیکن بڑی بی کے مسلسل شور مچانے سے آنکھ کُھل جاتی۔ بہر کیف غرناطہ پہنچتے ہی ساری کُلفت دُھل گئی ۔

فطرت اور فن کا امتزاج غرناطہ کو رعنائی و زیبائی بخشتا ہے۔ پس منظر میں سیرا نوا دا کی برف پوش چوٹیاں ہیں۔ اڑھائی ہزار فٹ کی بلندی پر ایک خوبصورت شہر اور اُس کے قدموں میں پھیلا ہوا زرخیز میدان، قصرِ الحمرا پہاڑی پر ہے۔ قلعہ اٹک کی طرح فصیل اور مینار سطحِ مرتفع کے نشیب و فراز طے کرتے ہوئے دریا تک چلے گئے ہیں۔ نشیب میں شہتوت کے جھُنڈ ہیں اور سدا بہار اشجار جن کی آبیاری سینۂ کوہ سے پگھلی ہوئی برف کرتی ہے ۔
جنارلیف —— جنّت العارف —— الحمرا کا نشاط باغ ہے۔ گھنے قد آور درخت، پیارے گلبن، دارو ندی یہاں اپنے خزانے لُٹاتی ہے۔ جنارلیف نہروں اور چشموں کے سنگھم پر ہے، شفاف آبِ رواں پھولوں اور خوشبودار جھاڑیوں میں کھو جاتا ہے۔ حنا بند

صحن چمن میں عہدِ رفتہ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ عنادل نوحہ خواں ہیں جیسے بُوحق ویران گھر کا ماتم کر رہے ہوں۔

محمد ابن نصر الاحمر شہابِ ثاقب کی طرح اُندلس کے اُفق پر اُس وقت نمودار ہوا جب ہسپانوی مسلمان خانہ جنگی میں مصروف تھے اور عیسائیوں کے ہاتھوں شکستیں کھا رہے تھے۔ الاحمر نے جس خانوادہ کی بنیاد رکھی اُسے اُندلس میں نصرانی اقتدار کے اڑھائی سو برس بعد تک حکومت کرنا تھی۔ اس فاتح کو جب لوگ ' غالب' کہہ کر پکارتے تو اُس کا جواب ہوتا لَاغَالِبَ اِلَّا اللّٰہ یہ ابدی حقیقت الحمرا کے گوشے گوشے میں مرتسم ہے گو مرورِ زمانہ سے تحریر مدّہم ہو گئی ہے۔

واشنگٹن ارونگ نے کہا تھا چاندنی رات میں الحمرا کا حُسن مسحور کر لیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے سحر میں اسیر ہوئے بغیر قصر کی تعریف کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ الحمرا میں داخل ہوتے ہی محسوس ہوتا ہے جیسے انسان پریوں کی دُنیا میں آ گیا ہو۔ سُورج کی شعاعیں اِس مرقّع کو رنگوں میں رنگ دیتی ہیں۔ پچی کاری سے آراستہ ہال کمرے، منقّش چھتیں، سنگِ مرمر کے ستون جن پہ طغراوی گلکاری ہو رہی ہے، توسیں نازک ستونوں سے اُبھرتی ہیں، اتنے نازک کہ تعجب ہوتا ہے کہ وہ اتنا بوجھ کیسے اُٹھائے ہوئے ہیں، چھتوں اور دیواروں پر نایاب چوبی ٹکڑیاں یوں جڑی ہیں کہ دیکھنے والا پیچ وخم میں کھو جاتا ہے۔ رنگوں کی بوقلمونی اور ٹکڑیوں کے ردّ و بدل سے بیک وقت توازن اور تنوّع کا تاثر ملتا ہے۔ آرائشی مرقّعوں کے اردگرد اور وسط میں آیات و ابیات فنِ خطاطی کا شاہکار ہیں۔ یہ پھُول پتیوں کے ساتھ یوں مدغم ہوتے ہیں کہ ذہن متوجہ نہ ہو تو محض نقش و نگار دکھائی دیتے ہیں، کثرتِ زیبائش کے باوجود نفاست کا دامن ہاتھ سے نہیں چھُوٹتا، لَاغَالِبَ اِلَّا اللّٰہ لَاغَالِبَ اِلَّا اللّٰہ کی تکرار ہر جگہ ملتی ہے۔ کوفی حروف میں یہ عبارت یوں لکھی ہے کہ بائیں سے دائیں اور دائیں سے بائیں پڑھا جا سکتا ہے۔ ایسے مُلک میں جہاں لوگ

سُورج کی تمازت سے جُھلس جاتے ہیں زیریں حصّے کے لیے ہلکے ثانوی رنگ مخصوص تھے جن سے آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ استرکاری کے لیے مور نیلگوں، سنہرا اور شنگرفی رنگ استعمال کرتے تھے تاکہ بالائی حصّے کی آب و تاب نمایاں ہو، محراب دار چھتیں زیبائش کی بہترین مثال ہیں۔ شش پہلو آرائش میں ہزاروں خانوں کو جلا دی گئی ہے۔ نکھیال کی طرح ایک خانہ دوسرے سے الگ تھلگ لیکن وحدت کا تاثر دینے کے لیے سب ایک دوسرے میں گھُل مل جاتے ہیں۔

ایوان السفّیر کا سنہرے پھُول کی طرح کھلتا ہوا، ہوادار گنبد جیسے بادل ساکت ہو جائیں یا رنگ بلیعار کر آئیں، اور اُوپر سنہری چھتری تن جائے، ٹھوس ہونے کی بجائے ہلکا اور سُبکسار صحن جہاں کھجور کی شاخ ایسی سبک قوسیں ستونوں سے اُبھر کر خیرہ کن رعنائی کا منظر پیش کرتی ہیں۔ دیوار پر سنہرا کام جیسے سورج کی شعاعیں طلاکاری میں ڈھل جائیں یا پتھر پہ کروشیا اور سوزن کاری کا باریک نمونہ ہو۔ نازک ہونے کے باوجود الحمرا کے محلات سات سو برس سے قائم ہیں۔ کارلوس پنجم نے ایک بے ہنگم بنگلہ محل الحمرا کے زیریں حصّے میں بنوایا جس کا بھُونڈا پن ذوقِ نظر کا خون کرتا ہے۔ موروں کے ذوقِ تزئین کے ساتھ یہ اچھا خاصا مذاق تھا۔

الحمرا کے معمار عرب خیمے سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے۔ ہوادار اور لطیف، خیمہ گاڑنے کے لیے نیزوں کی بجائے ترشے ہوئے نازک ستون! وہ سنگِ مرمر تراشتے رہے حتیٰ کہ ستون پھُول کے شاخچے کی طرح نازک ہو گئے، مشجر کی جگہ دیوار پر زردوزی، ہم آہنگ رنگوں سے ہر چیز فضا میں تیرتی معلوم ہوتی ہے۔ سمیں آبشار کی مدھم آواز بھی منظر کا حصّہ ہے۔ الحمرا کے خاموش ایوان اُس تابناک ماضی کی یاد دلاتے ہیں جب غرناطہ پر ہلالی پرچم لہراتا تھا، انھی ایوانوں میں ایک مردِ حُر کی آواز آخری بار گونجی تھی، "فرڈینینڈ اور ازابیلا کے وعدوں کا اعتبار نہ کرو، اہلِ قشتالیہ نے کب وعدے ایفا کیے، تمہارا ناموس کوڑیوں کے

مول نیلام ہوگا۔ اگر کچھ حمیت باقی ہے تو میرے پیچھے آؤ۔ بہادروں کی طرح میدان میں کٹ مرنا غلامی کی کربناک زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔" موسیٰ بن ابی الغزن کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر اُس کے پاس لوٹ آئی۔ ابو عبداللہ اور اُس کے اُمرا کی نظریں زمین میں گڑی رہیں۔ غیرت و حمیت کا چراغ گُل ہو چکا تھا۔ "جو اللہ کی مرضی"، موسیٰ نے گھوڑے کو ایڑ دی، گھوڑے کے سُم پختہ فرش سے ٹکراتے ایک اندوہناک خاموشی کو چیرتے ہوئے گزر گئے۔ فصیل کے باہر اُس کی مڈبھیڑ عیسائی جنگ جوؤں کے ایک دستے کے ساتھ ہوئی۔ دست بدست لڑائی میں اُس نے چھ سات کو ابدی نیند سُلا دیا۔ خود زخموں سے چُور ہو کر دریا میں کُود پڑا اور زرہ بکتر کے بوجھ سے اُس کی گہرائیوں میں اُتر گیا۔

غرناطہ کے شجیع شہر سے باہر حریفوں کو للکار کر دادِ شجاعت دیتے۔ وہ شیولری کے آداب ملحوظ رکھتے تھے۔ موسیقی کے دلدادہ، ہم پلّہ حریف سے جنگ، بیکسوں کی حمایت .... چودھویں صدی عیسوی میں الفانسو نے شاہِ غرناطہ یوسف کے خلاف فوج کشی کی اور جبل الطارق کا محاصرہ کر لیا، محاصرہ جاری تھا کہ الفانسو طاعون کا شکار ہو گیا۔ مور بہادروں نے جنگی کارروائی بند کر دی تاکہ ماتم کی رسومات ادا ہو سکیں۔ جب سوگوار نصرانی اپنے بادشاہ کی میت لے چلے تو اشبیلیہ تک مور افواج کے سپہ سالاروں نے یہ قافلہ اپنے علاقوں میں سے بلا تعرّض گزرنے دیا۔ کیا عجب دشمنوں کو بھی اعتراف تھا۔ "ہمارے مور حریف انسانیت اور شجاعت کے آداب سے آگاہ تھے۔"

ہسپانویوں کا 'بوب دل' اہلِ غرناطہ کا 'سلطان الصغیر' سر جھکائے آہستہ آہستہ جا رہا ہے، حرماں نصیب ابو عبداللہ، زوالِ اُندلس کی مجسم تصویر، غرناطہ کے آخری فرمانروا نے اپنی ماں عائشہ کے زیرِ اثر ایک مطلق العنان حکومت کا خواب دیکھا تھا۔ اس کی خاطر اُس نے فرڈیننڈ کی کٹھ پتلی بننا منظور کیا اور اپنے جری باپ مولائے حسن کے خلاف بغاوت کی اور بغاوت بھی اُس وقت جب وہ اہلِ قشتالیہ سے الحمۃ چھیننا ہی چاہتا تھا۔ مولائے حسن جس نے خراج طلبی پر

فرڈیننڈ کو لکھ بھیجا تھا " باجگزار فرمانروا مر گئے، اب ہماری ٹکسال میں سکوں کی بجائے شمشیر و سناں تیار ہوتے ہیں "

سقوطِ غرناطہ کے بعد ابو عبداللہ جلاوطنی کے دن گزارنے وادیِ برجینہ کی سمت جا رہا تھا، مڑ مڑ کر بصد حسرت الحمرا کی طرف دیکھتا، کچھ دیر بعد پارول کی چوٹی پر ٹھہر گیا اور آخری نظر اپنے محبوب شہر پر ڈالی۔ سرو مسلمانوں کے مقابر پر جھوم رہے تھے۔ گلستانوں کی آغوش میں قصرِ الحمرا جلوہ گر تھا۔ دُور اُفق پر بیکراں سمندر تھا جس کی موجیں چیر کر طارق اور موسیٰ کے جانباز ایک اجنبی مُلک مسخر کرنے آئے تھے۔ اُسے روتا دیکھ کر ابو عبداللہ کی ماں نے کہا "جس مُلک کو بچانے کے لیے تم نے جان کی بازی نہیں لگائی اُسے کھو دینے پر عورتوں کی طرح آنسو بہا رہے ہو"

غرناطہ کا زوال بتدریج نہیں ہوا، موروں کے زیرِ نگیں رستا بستا شہر شکست کے بعد دھڑام سے نیچے آرہا، وہ لُوٹ کھسوٹ جو فرڈیننڈ اور ازابیلا نے شروع کی تھی اُن کے کے پوتے کارلوس پنجم کے عہد میں وسیع پیمانے پر ہوئی۔ فن کے نوادر برباد کر دیئے گئے۔ "وحشی" موروں کے آثار ایک ایک کر کے مٹا دیئے گئے۔

ہسپانوی مؤرخوں کا ایک گروہ دعویٰ کرتا ہے کہ انہوں نے عربوں سے ورثہ میں کچھ نہیں پایا نہ ہی کسی چیز کے لیے وہ اُن کے احسان مند ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ سات سو برس حکومت کرنے کے باوجود مور اُن کی ثقافت اور طرزِ معاشرت پر اثر انداز نہیں ہوئے۔ یہ کُلیہ محلِ نظر ہے۔ اس دور میں بھی ہسپانوی باغوں میں مور طرز کی جھلک نظر آتی ہے۔ اشبیلیہ میں پلازا ہسپانیہ کی عظیم قوس اور حاشیے پر ستونوں اور محرابوں کی قطاریں مور فنِ تعمیر کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ چوک ۱۹۲۹ء کی نمائش کے لیے بنایا گیا تھا۔

عربوں کی طرح ہسپانوی کھانا پکانے کے لیے زیتون کا تیل استعمال کرتے ہیں جس کی تیز مہک ہر مطبخ سے اُٹھتی ہے۔ 'خوش دل و گرم اختلاط' اس حد تک کہ زبان سے

اجنبیت کے باوجود بات کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ہر نووارد کو خوش آمدید، ٹرین سے اُترتے وقت فرداً فرداً الوداعی سلام، "منانا" (آج نہیں) کا بکثرت استعمال یعنی آج کا کام کل پہ ڈال لیے! اور لنچ کے بعد طویل قیلولہ، قصّہ مشہور ہے کہ گرمیوں میں ایک امریکن تاجر ایک سرکاری ادارے کی گھنٹی بجاتا رہا، کواڑ کھٹکھٹاتا رہا لیکن دیر تک جواب نہ ملا، عرصے بعد ایک اُونگھتا ہوا چابی بردار نمودار ہوا تو امریکن نے پوچھا:

"یہ لوگ دوپہر کے بعد کام نہیں کرتے؟"

"جناب یہ لوگ صبح کے وقت کام نہیں کرتے۔ بعد دوپہر تو دفتر ہی نہیں آتے!"

مستشرق رائبیرو کی تحقیق کے مطابق ہسپانوی زبان اور شاعری بلکہ تخیل اور احساسات عربوں سے متاثر ہوئے۔ ہسپانیہ اور مغربی یورپ کے لوک گیت اُندلس سے وابستہ ہیں، سقوطِ غرناطہ کے بعد بھی کچھ مسلمان موسیقار باقی تھے جن کی دھنیں مغربی یورپ میں مقبول تھیں۔ عقیدہ میں اختلاف کے باوجود نصرانیوں اور مسلمانوں میں بہت سی اقدار مشترک تھیں، جہاں گیتوں میں ہسپانوی قوم کی شجاعت کا ذکر ہوتا ہے مور بہادروں کی تعریف ضرور ہوتی ہے۔

غرناطہ کے مضافات میں پہاڑ کاٹ کر جپسیوں نے رہائش کے لیے گپھائیں بنائی ہیں جو رات کو بجلی کی روشنی میں جگمگ کرتی ہیں۔ جپسی رقاصہ بل کھا کھا کر تیزی سے رقص کرتی رہی۔ کبھی ایک انداز سے مجیرے بجاتی کبھی پیتل کی تھالیاں ٹکرا کر نغمگی پیدا کرتی، سامعین "اُولے اولے" یعنی واللہ کہہ کر داد دیتے! ہمارا راہبر تیزی سے سفید شراب کے جام خالی کرتا رہا اور بڑھ چڑھ کے داد بھی اُسی نے دی۔ شعلہ رُخ مغنّیہ نے "غرناطہ سے مور کی ہجرت" کا پُرسوز گیت چھیڑا:

سُورج غروب ہو رہا تھا کہ غرناطہ سے چیخیں سنائی دیں
کوئی تثلیث کو پکار رہا تھا، کوئی رسولؐ کا واسطہ دے رہا تھا
قرآن رُخصت ہوا، صلیب اندر لائی گئی

الحمرا کے میناروں سے ہلالی پرچم اُتار پھینکا گیا
الوداع غرناطہ! اے بے مثل شہر
سات سو برس تو ایمان کا گہوارہ رہا
افسوس اب کافر تجھ پہ نازاں ہوں گے
یہاں بہادر ناموسِ مصطفیٰؐ کے لیے جان دیتے تھے یا وطن کی آبرو پر
یہاں باغات تھے، لہلہاتے کھیت تھے اور پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں
صد افسوس! رُوپ رُخصت ہوا، پھُول کُملا گئے

غرناطہ سے رُخصت ہوتے وقت تحائف خریدنے کا خیال آیا۔ تین لڑکیاں دکانداری کے فرائض انجام دے رہی تھیں، خُوش خلق، ہنس مُکھ اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے پر مصر، لیکن زبان دیوار کی طرح راستے میں حائل تھی۔ زیادہ گفتگو، اشاروں سے ہوئی۔ اُن کے اندازِ گفتگو میں عامیانہ پن نہ تھا جیسے فرانس یا اٹلی میں محسوس ہوا۔ چلنے سے پہلے میں نے سوچا ہسپانیہ سے کچھ تعلق جتانا چاہیئے لیکن زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔

"ہسپانیہ پر کبھی مور حکمران تھے"
"جی؟" (لاعلمی کی مسکراہٹ)
"ہمارا موروں سے روحانی تعلق ہے، ہم بھی مسلمان ہیں"
"جی!" (ایک اور مسکراہٹ)

مسلمانوں کے آثار دیکھنے کے لیے ایک دوست کار سے ہسپانیہ پہنچے اور حد عبور کر کے دو سو کلومیٹر تک چلے گئے، مشروبات کے لیے رُکے تو کہتے ہیں انہوں نے ایک اجنبی سے پوچھا "بھلا اب ہسپانیہ میں مسلمانوں کی کیا آبادی ہوگی؟" استعجاب اور بے یقینی کی پرچھائیاں ہسپانوی کے چہرے پر پھیل گئیں۔ "اس وقت آپ کے سوا شاید کوئی اور نہ ہو!" یہ بات سُن کر وہ اتنے آزردہ ہوئے کہ آگے جانے کی ہمّت نہ ہوئی، اُلٹے پاؤں لوٹ آئے۔

مورّخ نے اس سوال کا جواب تفصیل سے دیا ہے۔ عیسائی حکمران اُندلس کی غلامی اور ہلال کے عرُوج پر کڑھتے تھے، وہ عربوں کو کبھی معاف نہ کر سکے۔ بدعتوں سے متنفر بربر فلسفیوں کی جسارت حقارت سے دیکھتے تھے۔ یہ چکّی کے دو پاٹ تھے جو عرب ہسپانیہ کو پیس دینا چاہتے تھے۔ طلیطلہ، قرطبہ، بلنسیہ، اشبیلیہ، ایک ایک کر کے روشنیاں گُل ہو گئیں مگر داستانِ خونچکاں کا آخری باب لکھا جانا باقی تھا۔ موت سر پر منڈلا رہی تھی۔ عین اُس وقت جب فرڈیننڈ اور ازبیلا لڑکھڑاتی ہوئی سلطنت پر آخری ضرب لگانے کے لیے تیار تھے الزغل اور ابو عبداللہ کے درمیان دولتِ غرناطہ کا بٹوارہ ہو رہا تھا! پندرہویں صدی ختم نہ ہوئی تھی کہ الحمرا کی آخری شمع ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ ملکہ ازابیلا کی شاطرانہ چالیں بالآخر رنگ لائیں، سیّدی یحییٰ اور الزغل جیسے جانباز مجاہد مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہوئے۔ ۱۴۹۲ء کے پہلے مہینے کی دوسری تاریخ تھی کہ نصرانی فوج غرناطہ میں داخل ہو گئی، فاتحین نے عہد نامے کی خلاف ورزی کی، کارڈینل کی سرپرستی میں مسلمانوں کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا۔ مسلمانوں کی اکثریت ہسپانوی نژاد تھی۔ انہیں یاد دلایا گیا کہ اُن کے آبا و اجداد نصرانی تھے، عرصہ تک بچے کھچے مسلمان بظاہر عیسائیت کا دم بھرتے رہے لیکن سولہویں صدی میں شاہی فرامین کے ذریعے انہیں مذہبی طور طریق ترک کر دینے کا حکم دیا گیا ، سترھویں صدی کے آغاز میں پانچ لاکھ مسلمان کشتیوں میں سوار کر کے افریقہ کے ساحل کی طرف دھکیل دیئے گئے، چونکہ ان میں بیشتر دستکار اور حرفت پیشہ تھے۔ ہسپانیہ مدّتوں اقتصادی بدحالی کا شکار رہا، ایک اندازے کے مطابق سقوطِ غرناطہ سے جبری انخلا تک تیس لاکھ مسلمان جلاوطن ہوئے یا تہِ تیغ کیے گئے۔ یہ تھا ہسپانوی مسلمانوں کے مسئلے کا قطعی حل!

اہلِ بینش کو شکایت ہے کہ رُو بہ زوال قوم تاریخ کی اہمیّت نہیں سمجھتی، قوّتِ فہم سلب ہو جاتی ہے نوشتۂ دیوار پڑھنے کے باوجود لوگ افتراق و انتشار اور جنگ و جدال سے باز نہیں آتے، وقت کا دھارا بہتا رہا، اُس تند و سبک سَیل میں ایک پُرشکوہ تمدّن اور جگمگاتے

ہوئے شہر خاشاک کی طرح بہہ گئے ۔

دیدۂ خوننابہ بار نہ رو! اس قوم کی ہلاکت لابدی تھی، اغیار کی عیاری، حکمرانوں کی بدعہدی، مسلسل خانہ جنگی اور خوں ریزی، بدظن رعایا، مضمحل معاشرہ، ایمان وایقان کی روشنی بے نور ہوئی، آفاقی نظریے نسلی اور قبائلی تنگنائوں میں گھٹ کے رہ گئے، بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑانے والے یاسیت کی پہنیوں میں اتر گئے ۔

جنرل فرینکو نے اعتراف کیا تھا" ہماری جدوجہد کی تاریخ شاہد ہے کہ ہسپانوی زندگی کی اساس مذہب پر ہے ۔ یہ جذبہ کارفرما نہ ہوتا تو موروں کے خلاف ہماری کوششیں بارآور نہیں ہو سکتی تھیں"۔ اپنے تحفظ کی خاطر اقوامِ عالم نے مذہب کو اپنایا لیکن ملتِ اسلامیہ نے متعدد بار اس سے انحراف کیا، اللہ نے حکومت کو اپنا انعام قرار دیا، ہسپانیہ کے مسلمانوں نے اس نعمتِ عظمٰی کی قدر نہ کی اور لوحِ جہاں سے مٹا دیئے گئے ۔ صداقت، عدالت اور شجاعت کا سبق بھلا دینے والے امامت کے سزاوار کیونکر ٹھہرتے ؟

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (سورہ محمدؐ)

اور اگر تم (ان حقائق سے) روگردانی کروگے (تو تم بھی تباہ ہو جاؤگے اور) اللہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئے گا جو تم سے مختلف ہوگی ۔

لاریب اللہ کا فرمان برحق ہے ۔

۱۹۵۵ء

برگِ خزاں

نیست گر تازہ گلے برگ خزانے بمن آر

خزاں کا آغاز تھا۔

امسال گرمیوں میں بہت بارش ہوئی اور یوں خزاں کی آمد میں تاخیر ہوئی۔ لندن کے مضافات میں رنگوں کی وہ فراوانی تھی کہ دیکھا کیجیے، ہمارے شعرا نے پت جھڑ میں حسرت و یاس کا مُرقّع دیکھا، اسے شامِ زندگی سے تعبیر کیا۔ یوں بھی ہمارے ہاں خزاں کا موسم تادیر نہیں رہتا۔ انگلستان کی خزاں دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ انگریزی زبان کے شاعر خزاں کی تعریف میں کیوں رطب اللّسان رہے، قلعہ ونڈسر کی بلند فصیل کے نواح میں رنگوں کی بوقلمونی ذوقِ نظر کو دعوت دے رہی تھی:

داماںِ نگاہ تنگ و گُلِ حُسنِ تو بسیار

طالب علمی کے زمانے میں گھاس کا مخملیں فرش، شاعرانہ تعلّی تھی لیکن فصیل کے وسیع میدان پر سبز قالین کا گُمان ہوتا تھا۔ خزاں زدہ سنہرے پتّے مستانہ وار رقص کرتے ہوئے بگولے کی شکل اختیار کر لیتے، پھر اُلٹے پاؤں لوٹ جاتے جیسے اسٹیج سے پرے ہٹ رہے ہوں۔ عظیم اشجار زندگی کے سفر کی عکاسی کرتے تھے۔ زیریں حصّہ سرسبز،

بالائی حصّہ خزاں زدہ، ٹنڈ منڈ شاخیں پتیوں سے عاری، پبلک اسکول کے میدان میں فٹبال کا میچ جوش و خروش سے کھیلا جا رہا تھا، نہ صرف کھلاڑی بلکہ تماش بین بھی کھیل میں برابر کے شریک تھے۔

یونانی کہتے تھے جب کھیل کے میدان سُونے ہو جائیں تو سمجھو قوم ختم ہونے کو ہے۔ انگریزی کہاوت ہے کہ واٹر لُو کی جنگ ایٹن کے کھیل کے میدان میں جیتی گئی، فاتح واٹر لُو ڈیوک آف ویلنگٹن، لارڈ کرزن اور لارڈ روزبری ایسے نامور لوگوں کی یہی درسگاہ تھی، باقاعدہ ورزش، گھوڑے کی سواری، سادہ خوراک، ڈیوک کے فولادی اعصاب ایٹن کی تربیت میں ڈھلے تھے۔ فرانس کے خلاف محاذ آرائی کے دوران ڈیوک اتحادی فوجوں کا سپہ سالار تھا۔

"فوج کل کس وقت کوچ کرے گی؟"

"پَو پھٹنے پر"

"کھانے کے لیے کیا ہو گا؟"

"اُبلا گوشت"

آرام طلب، خوش خور ہسپانوی اے۔ڈی۔سی کے لیے دونوں جواب سوہانِ رُوح ہوتے۔

کچھ عرصہ ہوا لاہور میں ایک انگریز ملنے آئے، وہ یوگنڈا کے سابق گورنر تھے اور اقوامِ متحدہ میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ میں ایک پاکستانی پبلک اسکول کے متعلق اُن کے تاثرات معلوم کرنا چاہ رہا تھا جو وہ دیکھ چکے تھے۔ وہ خاموش رہے تو مجھے کہنا پڑا۔

"آپ کے خیال میں وہ اسکول بچّوں کو آرام طلب بنا دے گا؟"

"جی ہاں، جس پبلک اسکول میں مَیں نے تعلیم پائی وہاں آسائش نام کو نہ تھی،

کام بہت تھا، ہمیں مشقّت کی عادت ہوگئی، زندگی کے کسی مرحلے پر مجھے اسکول سے زیادہ کام نہیں کرنا پڑا نہ ہی کبھی اُس سے کم آسائش ملی!" ہم مغربی اداروں کی نقل تو کرتے ہیں لیکن نقل را عقل باید!

تیز رفتار زمین دوز ریل ٹمپرنگ سے نکل کر وندناتی ہوئی آکسفورڈ سرکس اسٹیشن میں داخل ہوتی ہے لیکن یہاں کسی میں ہمّت نہیں کہ اُس کے سامنے چھلانگ لگا کر خودکشی کرلے، کوئی فرہاد جو جان پہ کھیل جائے، شاید رسمِ عاشقی ایسے ملکوں کی پیداوار ہے جہاں غربت اور افلاس ہے۔ جہاں درد کی کیفیت مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ مغرب میں لوگ حال مست مال مست ہیں، یہاں خودکشی کے واقعات سُننے میں نہیں آتے۔

مَیں دیوار پہ چسپاں "ٹیوب" کا بڑا نقشہ دیکھنا چاہتا تھا لیکن اُس کے عین سامنے چوڑی کمر والی لڑکی ایڑیاں اٹھا کے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ چُہلیں کر رہی تھی، کبھی اُس کے بال سہلاتی، کبھی گال کی چٹکی لیتی۔ مرد کی آنکھوں کے گرد مکڑی کا جال پختہ عمر کی غمّازی کرتا تھا۔ کسی اجنبی کے ذہن میں یہ سوال ضرور اُبھرے گا کہ اِس ملک میں عفّت و عصمت کا کیا تصوّر ہے لیکن چند روز پیشتر اس کا جواب میکا ٹیھر نے دیا تھا "ایک صحت مند شخصیّت کے لیے ضروری ہے کہ وہ آزاد فضا میں پھلے پھُولے، خام قوانین اور خود ساختہ اصول اس کی راہ میں حائل نہیں ہونے چاہیئں۔ رفیقِ زندگی کے انتخاب میں ہم نے عورت اور مرد کو پوری آزادی دی ہے۔ تین ہزار برس پہلے جب مذہب کی گرفت سخت نہیں تھی انسان فطرت کے قریب تھا اور بڑی حد تک آزاد تھا لیکن مذہب، معاشرہ، آداب، رسوم، خدایا پناہ! انسانی فطرت گھُٹ کے رہ گئی، بونے پیدا نہ ہوتے تو کیا ہوتا ...." کیمبرج سے فارغ التحصیل میکا ٹیھر کی صحت اچھی نہیں تھی، اُس کے چہرے اور اعصاب پر تُند جذباتی تجربوں کا اثر نمایاں تھا۔

شام کے پانچ بج رہے تھے RUSH HOUR کی وجہ سے اسٹیشن کے دروازے پر وہ ہجوم تھا کہ اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا سانس تک لینا دوبھر تھا، چند منٹ کیلیے سب اپنی اپنی جگہ پہ جم کے رہ گئے تھے، اِس عالم میں بھی ایک صاحب انہماک سے پڑھتے رہے، کتاب اور آنکھوں کے درمیان مناسب فاصلہ رکھنے کی گنجائش تو تھی نہیں، سیدھا سر، سینے سے چمٹی ہوئی کتاب، محویت کا یہ عالم کہ لحظہ بھر کے لیے بھی نظر کتاب سے نہیں اُٹھی، اپنے کام سے کام ——— انگریز کے کردار کا ایک پہلو ہے۔

لندن "ٹیوب" میں رات گئے باہمی اعتماد پہ کام چلتا تھا۔ زمین دوز ریل سے اُترتے وقت مسافر گیٹ کیپر کو ٹکٹ کے برابر سکّے تھما دیتے۔ وہ کبھی جرح نہیں کرتا تھا کہ میاں کس اسٹیشن سے سوار ہوئے تھے یا جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔

ٹیوب اسٹیشن کے باہر گیٹ کیپر نے بات شروع کر دی۔

"جنگ کے زمانے میں مَیں ہندوستانی فوج میں تھا، یہ بٹوارہ اچھا نہیں ہوا۔"

"ہندو اور مسلمان صلح و آشتی سے نہ رہ سکے، اس لیے تقسیم ناگزیر ہوگئی۔"

"ملازمت کے دوران مَیں دہلی میں تھا، کوئی شخص دہلی سے ہو یا کشمیر سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فرق یہی کہ ایک حاکم ہے دوسرا محکوم۔"

"یہ بُری بات ہے، دیکھئے وہ نیگرو آرہا ہے، رنگ کی وجہ سے مجھے اُس پر برتری حاصل نہیں، وہ بھی مجھ جیسا انسان ہے۔"

"بالکل درست، کاش سب سفید فام لوگ یونہی سوچتے۔"

انہی دنوں اینک پاول کے متشدّدانہ بیانات سے فضا مکدّر ہو رہی تھی سفید فام والدین کو خدشہ تھا کہ جنوبی انگلستان کے اسکولوں میں سانولے بچّوں کی کثرت سے

انگریزی زبان اور صحت کا معیار پست ہو جائے گا، علیحدہ اسکول کھولنے کا رجحان بھی موجود تھا۔

چند دنوں بعد ریل گاڑی کی "GO SLOW STRIKE" شروع ہو گئی۔ برائیٹن سے چلے تو سیدھی وکٹوریہ جانے کی بجائے گاڑی اگلے اسٹیشن پر رک گئی، لاؤڈ اسپیکر اعلان کر رہا تھا "دوسرے پلیٹ فارم پر رکی ہوئی گاڑی میں سوار ہو جائیے"۔ میں بمشکل سوار ہوا تھا کہ گاڑی چل دی۔ ایک آئرش نوجوان اسی ڈبے میں سفر کر رہا تھا، اس سے پوچھا یہ کیا بوالعجبی تھی، وہ کہنے لگا "قاعدے کے لحاظ سے ڈرائیور کا وقت ختم ہو چکا تھا، اس کا کہنا ہے کہ یونین کے فیصلے کے مطابق وہ اضافی اجرت کے لیے زائد وقت کام نہیں کرے گا اور گاڑی پلیٹ فارم پر چھوڑ کے گھر چلا گیا! آپ خوش قسمت ہیں کہ یہ گاڑی بروقت آ گئی، جزوی ہڑتال کی وجہ سے کل شام کوئی گاڑی اسکاٹ لینڈ نہیں گئی، لوٹ ٹرین سے آنے والے مسافروں کو رات اسٹیشن پہ گزارنا پڑی"۔

بی او اے سی کے ہواباز امریکی ہوابازوں کے برابر تنخواہ مانگ رہے تھے، ہڑتال کی وجہ سے بی۔ او۔ اے۔ سی کو پچیس لاکھ پونڈ کا خسارہ ہوا، اور ریلوے کو تیس لاکھ پونڈ کا۔ فورڈ موٹر کے کارخانے میں سلائی کرنے والی عورتوں نے ہڑتال کی تو چار کروڑ پونڈ کا ٹھیکہ منسوخ ہو گیا، یہ عورتیں مردوں کے برابر اجرت مانگ رہی تھیں۔ آئرش نوجوان نے کہا میں ہڑتالوں سے زچ ہو کر وینکوور جا رہا ہوں، کینیڈا کی آبادی کم ہے اور وسائل لامحدود، اسی لیے سالانہ شرح ترقی بیس فی صد ہے۔

کیا کارکنوں کو ملک کا نظام مواصلات معطل کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے خصوصاً جب صنعتی میدان میں سخت مقابلہ درپیش ہو؟ اخبارات اور ٹیلی ویژن پر یہ ادق مسئلہ زیر بحث تھا۔ پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے کہا کہ عوام کی سہولت کی خاطر یہ ضروری ہے کہ ریل، ڈاک، گیس اور بجلی ایسے اداروں میں ملازمت کی شرائط بہتر کر دی جائیں اور

اُجرت بڑھادی جائے لیکن ہڑتال کرنے کا حق واپس لے لیا جائے، اگر شروع دن سے ایسا معاہدہ ہو تو کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی۔ ٹریڈ یونین کے حامیوں کو شکوہ تھا کہ ملک میں غیر جانبدار ثالثی معدوم ہے، ٹریڈ یونین برداشت کرلی جاتی ہے لیکن صنعت میں حصہ دار نہیں بنائی جاتی، تین فی صد آبادی کو کھلی چھٹی ہے کہ وہ من مانی کارروائی کرکے دولت سمیٹ لے جسے حاصل کرنے میں درحقیقت سب کا حصہ ہے۔ ارتکازِ دولت سے معاشرے میں پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ہر قوم کو خود فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کس قسم کا اقتصادی نظام چاہتی ہے اور اس کے حصول و قیام کیلئے کون سا راستہ اختیار کرے۔

قصرِ بکنگھم کے باہر ٹیلی ویژن کا نمائندہ راہگیروں کو انٹرویو کر رہا تھا۔ یہ اظہارِ رائے کا دلچسپ مظاہرہ تھا۔

"محل کے جنگلے پہ سات ہزار پونڈ کی لاگت سے سونے کا پانی پھیرا گیا ہے، آپ کے خیال میں یہ فضول خرچی نہیں خصوصاً جب رفاہِ عامہ کے اہم کام سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے رُکے پڑے ہیں؟"

"مجھے اتفاق ہے کہ یہ ضیاع ہے۔"

ایک خاتون نے اس رائے سے اختلاف کیا "میرے خیال میں یہ اچھی بات ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری قوم میں جان باقی ہے، یہ سیاحوں کے لیے کشش کا باعث ہوگا، جو قوم چائے پینے کے لیے دو وقفے کرتی ہے وہ یہ خرچ بھی برداشت کرسکتی ہے!"

انگلستان میں رائے عامہ کی بڑی اہمیت ہے، اُمراء یا محنت کش طبقے کی رائے نہیں بلکہ بیدار مغز، خود شناس متوسط طبقے کی رائے جسے مستحکم ہوتے وقت لگتا ہے لیکن جب مستحکم ہو جائے تو چٹان کی طرح مضبوط ہوتی ہے، پھر اُسے نظر انداز کرنا یا اُس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں، ملاح، ماہی گیر اور کان کن سخت جان لوگ ہیں، وہ

جنگ میں اچھے سپاہی ثابت ہوئے، بیشتر افسر، اسکولوں کے اساتذہ، یونیورسٹی کے طلبا، تجارتی اداروں اور بینکوں کے کارکن تھے یا اُن کا تعلق قانون دان اور اخبار نویس طبقے سے تھا، وہ سیاسی شعور رکھتے تھے، انہیں علم تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔ یہ لوگ معاشی اور اقتصادی ڈھانچہ یکسر بدلنا چاہتے تھے، جنگ کی جیت کا سہرا ونسٹن چرچل کے سر رہا لیکن انتخابات میں انگریز قوم نے اُسے بیک بینی و دوگوش نکال باہر کیا۔ اینتھنی ایڈن کا آناً فاناً جانا بھی رائے عامہ کی شدید مخالفت کے باعث تھا۔ عربی کا عالم ہونے کے باوجود ایڈن نے سویز ایسی فاش غلطی کی، تکلیف دہ بات یہ تھی کہ کنسرویٹو پارٹی اور عوام الناس نے جارحانہ حملے کی مذمت نہیں کی مگر انہیں اس بات کا ملال تھا کہ مہم بُری طرح ناکام ہوئی! یہ انگریز کے کردار کی ایک اور جھلک تھی۔

مَیں لندن میں ہی تھا کہ اخبارات نے سُرخی جمائی "وزیراعظم میکمیلن ایک اہم آپریشن کے لیے ہسپتال میں داخل ہوگئے، انہوں نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔"

وزارتِ عظمیٰ کے دَور پر بی بی سی سے میکمیلن کا انٹرویو نشر ہو رہا تھا، ایک سوال پروفیومو اسکینڈل کے متعلق تھا، "وزیراعظم صاحب! آپ اندرونِ ملک کے معاملات اور امورِ خارجہ میں اتنے منہمک رہے ہوں گے کہ آپ کو اس قضیے کی اصلیت جاننے کی فرصت نہ ملی ہو گی؟"

"مَیں بے حد مصروف تھا، یہ بھی درست ہے کہ مختلف فرائض کی ادائیگی کے لیے وقت درکار تھا لیکن یہ کہنا کہ اس قضیے کی نوعیت جاننے کے لیے میرے پاس وقت نہ تھا یہ کہنے کے مترادف ہوگا کہ میں اپنے فرائض صحیح طور پر انجام نہیں دے رہا تھا، سچ تو یہ ہے کہ مَیں نے اس معاملے پہ پوری توجہ دی تھی لیکن جب کوئی شخص اپنی آن کی قسم کھائے تو آپ اُسے سچّا سمجھتے ہیں، اسی لیے میں نے اس ضمن میں پوری ذمہ داری قبول کی تھی، اگر پروفیومو بے گناہ ہوتا اور میں اُسے مجرم گردانتا تو دم واپسیں

تک اپنے آپ کو معاف نہ کر سکتا"۔ یہ میکمیلن کی جبلّی شرافت کی دلیل تھی، دوسروں کی تکریم وہی کرتا ہے جسے اپنی عزّتِ نفس کا پاس ہو، جس شخص کی نظر میں اپنی ذات لائقِ احترام نہیں وہ دوسروں کو ذلیل کرنے میں پیش پیش ہو گا۔

کنسرویٹو پارٹی کی قیادت کا مسئلہ سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ قیادت کے اُمیدواروں پر بالعموم بے لاگ تنقید ہوتی تھی۔ جب لارڈ ہیلشم نے لارڈشپ سے دست بردار ہونے کا اعلان کیا تاکہ دارالعوام میں نشست حاصل کر کے وزیرِاعظم بن سکیں تو ویج وڈبن نے پھبتی کسی " اگر کسی کی شہرت چالاک ہونے کی ہو تو سیاسیات میں بھی اُسے نقصان پہنچ سکتا ہے"۔ پریس اور بی۔بی۔سی۔ اُمیدواروں کے عزائم کا سختی سے محاسبہ کر رہے تھے، ٹیلی ویژن نے تنقید پر اکتفا نہ کی، تینوں اُمیدوار بھانڈوں کے لباس میں سکرٹ پہن کے آ گئے، کوئی بٹلر بنا تو کوئی ماڈلنگ اور ہیلشم اور اپنے بیانات سے اقتباسات مزاحیہ انداز میں گا کے سنائے۔

کنسرویٹو پارٹی کے لیڈر مسٹر بٹلر نے بلیک پول میں تقریر کی " لیبر پارٹی کہتی ہے گورنمنٹ ضرور تبدیل ہونی چاہیئے، اگر اصول یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنی باری لینی ہے تو احمقوں کو بھی موقع ملنا چاہیئے! جب ہم نے لیبر کو شکست دی تو انہوں نے کہا کہ وہ یہ وقفہ تربیت حاصل کرنے میں صرف کریں گے، ظاہر ہے کہ وہ تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کر رہے ہیں"۔ (پُرجوش تالیاں) حاضرین میں سے کسی نے جُملہ چُست کیا " یہ لیڈر کا انتخاب ہے یا ملکۂ حُسن کا چناؤ جہاں مقبولیت کا معیار دیر تک تالیاں بجانا ہے۔

بٹلر نے تقریر جاری رکھی " مخالفین ہمیں شہنشاہیت کا طعنہ دیتے ہیں، ہم نے دُور اُفتادہ ملکوں میں یونین جیک بلند کیا، جہاں لاقانونیت کا دَور دورہ تھا تنظیم و نسق قائم کیا، کرۂ ارض کے ایک چوتھائی حصّہ پر لوگوں کا معیارِ زندگی بہتر بنایا۔

ہم برٹش راج کے متعلق شرمسار نہیں بلکہ اُس پہ نازاں ہیں"۔ (تالیاں)

تقریر میں اُس جبر کا ذکر نہ تھا جو صدیوں روا رکھا گیا، نہ ہی اُس اندازِ حکومت کا جس کا واحد مقصد برطانیہ کی صنعت و تجارت کو فروغ دینا تھا، بٹلر صاحب! ہمیں اقرار ہے کہ آپ بیشتر سفید فام آقاؤں سے بہتر تھے لیکن غلط بیانی سے فائدہ؟ ایک ماہرِ اقتصادیات نے کہا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے وقت ہر سو پونڈ میں سے جو کسی انگریز نے بنک میں جمع کروائے تھے دس پونڈ مطیع ممالک سے آئے تھے اور اُس حد تک اُسے محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ میکا آیتھر نے بھی صاف گوئی سے کام لیا تھا: "آزادی سے پہلے میرے ہم وطنوں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ ہر قوم کو آزاد ہونے کا حق ہے، یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ ہم نے لوگوں کے لیے ریل کی پٹڑی بچھا دی، پختہ سڑکیں بنا دیں یا بنجر زمین کو آباد کیا۔"

ایک محفل میں ایشیائی و افریقی ادارے کے سربراہ مجھے کہنے لگے، "دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہماری تاریخ میں ایک عجب دَور آیا، ہم نوآبادیات سے محروم کیا ہوئے عالمی مسائل سے بھی بے نیاز ہو گئے، ہماری توجہ اندرونی معاملات پہ مرکوز ہو گئی، یہ رویہ قابلِ افسوس تھا، ایک بڑی طاقت کا فرض ہے کہ چھوٹے ملکوں کی مدد کرے۔" فیلڈ مارشل منٹگمری بھی نشاکی ہیں کہ اپنے آپ میں محو ہو کر برطانیہ نے عالمی قیادت کا موقع کھو دیا، اس کوتاہی کے لیے تاریخ اُسے معاف نہیں کرے گی۔۔۔ برطانوی سلطنت پر سورج غروب ہو چکا، قومی مافی الضمیر میں کسک باقی ہے، یہ احساسِ زیاں تو نہیں؟ حکومت جا چکی، حکمرانی کی ہوس نہ گئی - WHITE MAN'S BURDEN، غیر مہذب لوگوں کو شائستگی سکھلانے کی ہوس!

لندن یونیورسٹی کی طرف سے شبینہ اور تھیٹر کی دعوت میں وائس چانسلر ڈاکٹر نوبل میزبان تھے۔ برٹش کونسل سے ڈاکٹر فلپس، اُن کی بیگم اور لندن کاؤنٹی کونسل کی تعلیمی کمیٹی کی چیئرمین مسز میکنٹاش بھی مدعو تھیں، مسز میکنٹاش نے فخر سے کہا" ہماری کونسل کی منصوبہ بندی کمیٹی اور رفاہ عامہ کمیٹی کی چیئرمین بھی خواتین ہیں، کوئی خاتون مالیاتی کمیٹی کی چیئرمین نہیں رہی لیکن ہماری باری ایک روز آئے گی۔ مَیں لندن یونیورسٹی میں عمرانیات کی پروفیسر بھی ہوں"۔ مسز میکنٹاش حقوقِ نسواں کی زبردست حامی تھیں، اُن کے لہجے میں خود اعتمادی اور کرختگی تھی، اُس کے برعکس مسز فلپس کی باتوں میں مشرقیت کی جھلک تھی " ہمارا بیٹا اس سال یونیورسٹی کا امتحان پاس کرکے گھر سے چلا جائے گا" اور پاکستانی ماں کی طرح وہ آبدیدہ ہوگئیں۔

فلپس دلکش شخصیت کا مالک تھا، اُس کے شائستہ طرزِ گفتگو میں خاموش ظرافت کی رمق تھی،" کسی انگریز کو ذرا کریدو تو معلوم ہوگا کہ اُسے سمندر سے محبت ہے یا زرعی زمین سے، پانچ برس ہوئے ہم نے کینٹربری کے قریب ایک زراعتی فارم خریدا تھا جب ہم نے اطالوی سفارت خانے میں اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کیا تو اُنہیں یقین نہ آیا، وہ حیران ہوکر کہنے لگے" تمہارا ارادہ دہقان بننے کا ہے، نہیں نہیں! انگلستان میں کسان بننے سے شرافت پر دھبّہ نہیں آتا، ہماری فارم میں چالیس گائیں تھیں، اتوار کو میری بیوی خود دودھ دوہتی تھی، اُسے یہ کام پسند تھا لیکن بکھیڑے بہت تھے، کبھی گائیں بیمار کبھی ملازموں کی کمی، فارم بیچنا پڑا تاہم ہمیں کینٹربری رہنا پسند ہے، ہر روز کام کے سلسلے میں لندن آتا ہوں"

پُرانی ضرب المثل اوّل کھیتی دوئم بیوپار...... برّصغیر تک محدود نہیں، دنیا کے اس حصّے میں بھی لوگ زمین کے دلدادہ ہیں، صنعتی دَور میں شہروں میں کچھ سہولتیں میسّر تھیں لیکن اسکاٹ لینڈ کے کسان برسوں کہتے رہے۔ ہم فیکٹری کی سیٹی کے پابند نہیں کہ

فلاں وقت ضرور پہنچ جائیں ۔ جب فرصت ہو گی ہم کام پر آئیں گے اور جب جی چاہے گا اپنے محبوب بکر وفٹ کو لوٹ جائیں گے تاکہ کھیتی باڑی میں ماں باپ کا ہاتھ بٹا سکیں ۔

رائل کورٹ تھیٹر میں EXIT THE KING اسٹیج ہو رہا تھا، کھیل کی مقبولیت کے لیے سر ایلک گینس کا نام کافی تھا، یہ ایک رمزیہ تمثیل تھی ۔ مرحومہ بیوی موت کا روپ دھار کر بادشاہ کی رُوح قبض کرنے آئی ہے اور اُس کے کاندھوں سے بوجھ اُتار کے آنے والے سفر کے لیے سُبکسار کر رہی ہے، فوج کا فکر نہ کرو، اولاد کا غم نہ کرو، جائیداد کے متعلق مت سوچو، دُنیاوی قضیے یہیں چھوڑ جاؤ، ایک نیا سفر درپیش ہے، خوش آں راہی کہ سامانے نگیرد، لیکن بادشاہ مرنا نہیں چاہتا، اُس کی آنکھوں میں زندگی کی گرسنگی جھلک رہی تھی: "نہیں نہیں، اگر میرے خویش و اقارب ختم ہو جائیں، اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی ختم ہو جائے، میں تنہا رہ جاؤں اور مجھے مسلسل ڈاڑھ کا درد رہے۔ میں تب بھی زندہ رہنا چاہوں گا، مجھے زندگی بے حد عزیز ہے۔"

ONE ACT کھیل کے دوران ایلک گینس نے اسٹیج نہیں چھوڑی، کھیل شروع ہوا تو وہ اچھا بھلا تھا ۔ جب بوڑھا اور بیمار بنا تو ایسا پوپلا مُنہ بنا کے بات کرتا تھا جیسے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، چہرے پہ روشنی ڈال کے بڑھتی ہوئی علالت اور ضعیفی کے اثرات اُجاگر کیے گئے تھے، انگریز تھیٹر کا بادشاہ ہے ۔

کسی زمانے میں سیاہ سوٹ اور سیاہ جوتوں کے بغیر تھیٹر میں داخل ہونے کا تصوّر نہیں کر سکتے تھے لیکن نئی نسل نے یہ آداب بالائے طاق رکھ دیئے ہیں ۔ ایک نوجوان کی نیلی پتلون بدرنگ ہو چکی تھی، جا بجا پیوند لگے تھے ۔ آشفتہ حال، ننگے پاؤں لڑکیاں تھیٹر میں بے تکلّف گھوم رہی تھیں ۔

صبحِ کاذب تھی کہ گاڑی ایڈنبرا پہنچ گئی ۔ مدہم پیتال نور کے پس منظر میں ایڈنبرا

کی مشرقی اسکائی لائن آہستہ آہستہ اُبھر رہی تھی، کلیساؤں کے کلس اور کنگرے، درگاہوں کے گنبد، پرانی طرز کے مکان اور مخروطی شہ نشیں قطار اندر قطار۔

سیزن کی آخری بس شائقین سے بھری تھی۔ اب موسمِ بہار کے آغاز تک سیاحوں کی گاڑیاں عازمِ سفر نہیں ہوں گی۔ اسکاٹ لینڈ کے چوٹی کے رئیس اور زمیندار دودمانِ لنلتھگو کا خاندانی گھر قصرِ ہیوپٹن ایڈنبرا سے دُور نہیں، صدیوں پیشتر بادشاہِ وقت شکار کھیلتے ہوئے ایک رات کے لیے ان کے آباؤ اجداد کا مہمان ہوا تھا۔ اسکاٹس آج بھی اُس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ دادا آسٹریلیا کا گورنر جنرل، باپ ہندوستان کا وائسرائے موجودہ مارکوئس لندن اسٹاک ایکس چینج میں ایک کامیاب دلال، لنلتھگو۔ اس نام سے بھی کیا یادیں وابستہ ہیں۔ ایک سخت گیر وائسرائے جس نے ۱۹۴۲ء کی QUIT INDIA کی تحریک کو سختی سے کچلا۔

کچھ مسافت طے کرنے کے بعد جھیل الخیرے نظروں کے سامنے تھی، اُس پار پہاڑ کے دامن میں تسیتوطرز کا بنا ہوا پُرشکوہ ٹراسز ہوٹل تھا، "ٹراسز" فرانسیسی ماخذ کا لفظ ہے، جو WHISTLING COUNTRY کہتے ہیں

بنسری جیسے بجاتا ہو کہیں دُور کوئی
یوں دبے پاؤں بیاباں سے ہوا آتی ہے

خزاں جوبن پہ تھی، رنگوں کی فراوانی سے جنگل میں آگ لگی تھی، سورج پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا، "زنگ آلود" پہاڑیاں اور براؤن گھاس سبھی کچھ نکھر گیا، ٹورسٹ بس میں بڑی بوڑھیوں کی کثرت تھی جن کے خاوند ترقی کے زینے پر چڑھتے چڑھتے پیش از وقت اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ یہ بیبیاں حتیٰ الوسع کوئی دلچسپ کوچ ٹورس نہیں کرتیں، سورج کی تمازت اور آرام دہ سیٹ، سموری کوٹ والی خاتون کھڑکی کے شیشے سے ٹیک لگا کے سوگئی، سُرخ ٹوپی والی بُڑھیا غنودگی کے عالم میں اُس پہ جُھک گئی، ڈرنگی

جھیل سطح سمندر سے آٹھ سو فٹ بلند ہے۔ جھیل میں جزیرے پر ایک خانقاہ کے کھنڈرات نظر آرہے تھے، اسکاٹس کی ملکہ میری نے کبھی یہاں پناہ لی تھی، سر والٹر اسکاٹ نے اپنی شہرۂ آفاق طویل نظم "لیڈی آف دی لیک" کے لیے یہیں سے مواد حاصل کیا تھا، سموری کوٹ والی عورت ابھی خواب خرگوش میں تھی، نیند کی وجہ سے وہ خوبصورت مناظر سے محروم رہی، زندگی کا بھی یہی حال ہے، ہم سو رہتے ہیں اور احساس زیاں تک نہیں ہوتا۔ ہم جھیل کا چکر کاٹ کر فراز پہ ہو لیے، دریائے ٹوبڈ ہمارے رُوبرو تھا۔ راہبر کہہ رہا تھا "تاریخی اعتبار سے یہ علاقہ بہت اہم ہے' یہاں انگریزوں کے ساتھ ہماری جنگیں ہوئیں، ہر مقام سے وابستہ سر والٹر اسکاٹ کی کوئی کہانی ضرور ہوگی۔"

خوں ریز خانہ جنگیاں ختم ہو چکیں، معاشرے میں حیرت انگیز تبدیلی آچکی ہے۔ کارکنوں کی طرف سے مساوات کا تقاضا ہے۔ یونیورسٹیوں میں نشستیں بڑھائی جائیں، زیادہ اسکول کھولے جائیں، تعلیم کا خرچ حکومت برداشت کرے، اب لوگوں کو فراغت بیّسر ہے اور اُس سے حظ اُٹھانے کے لیے وافر روپیہ، کنارِ آب پکنک کرنے والوں نے دُھونی رمائی تھی، چائے اور ناشتہ تیار کیا جا رہا تھا۔ دلآویز گوشوں سے اسکاؤٹ کیمپ اور یوتھ ہاسٹل جھانک رہے تھے، کاروں کی قطاریں برطانیہ کی خوش حالی کا پتہ دیتی تھیں، برطانیہ کی چھوٹی کاریں دیکھ کر مجھے خیال آیا یہ عجیب بات ہے ملک جتنا پسماندہ ہو لوگ اتنی بڑی کار استعمال کرتے ہیں!

تیز رفتار گاڑی جھیل لیمان کے کنارے تراشتی جا رہی تھی، مکئی کی فصل سر اٹھائے کھڑی تھی، ناہموار زمین پر خوشنما پودوں کی قطاریں کسی جابکدست، کسان کی مرہونِ منت تھیں، جھیل کے کنارے قدیم وضع کے مکان اور آراستہ پائیں باغ، انگور کی بیلوں

کے طویل وعریض قطعے اور دُور فرازِ کوہ پر ننھّے ننھّے گھروندے، لوزین سے گزرتے ہی جھیل کا بھرپور منظر سامنے تھا اور بادلوں میں سے چھنتا ہوا دلفریب دُھندلکا، دُھوپ میں نہائی ہوئی وادی میں مطمئن گائیں چر رہی تھیں، شاہ بلوط کی قطاریں، سُرخ چھت والے مکان، قلعوں کے سُرخ برج پر سوئٹزرلینڈ کا سُرخ پھریرا، بیچ میں سفید صلیب کا نشان؛ اس "ڈرنی لینڈ" میں اُونچے نیچے راستوں پر کبھی کوئی کار دوڑتی نظر آجاتی، پرانے قلعے اور مکان اس صوبے کی قدامت، کا پتہ دیتے تھے۔ یہ جنّتِ نگاہ تھی کہ کبھی چمن مکان کی دہلیز تک جا پہنچتا، کبھی مرغزار ریل کی پٹڑی تک سرک آتا، رفاقت اور دمسازی کا یہ سلسلہ دیر تک قائم رہا، ریل کی رفتار اسّی بچاسی میل سے کیا کم ہوگی لیکن اتنی سُبک خرام کہ موٹر پر پہیوں کی صدا پُرسکون ماحول میں ضم ہو جاتی، کوئی شکایت تھی تو یہ کہ نظارے سے لطف اندوز ہونے کی مہلت نہیں تھی۔ تُھن اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہوئی تو میں نے ایک نووارد خاتون سے پوچھا، "آپ انگریزی بول لیتی ہیں ؟"

"جی کچھ کچھ سمجھ لیتی ہوں، مَیں امریکن ہوں!" مسز ڈیوڈ نے کہا۔

ڈیوڈ ماہرِ ارضیات تھا، بیوی نیومیکسیکو میں پڑھاتی تھی۔ ارضیاتی لحاظ سے ڈیوڈ مرن کی نواحی پہاڑیوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ہمارے اردگرد وسطی سوئٹزرلینڈ کی چراگاہیں بکھری تھیں گہرے سبز رنگ کی گھاس جیسے کسی مصوّر نے برش کی ایک جنبش کے ساتھ جنبش کیا ہو۔ ڈیوڈ کہہ رہا تھا مونٹانا اور کولوراڈو کے [illegible] خوبصورت ہیں لیکن گھاس میں یہ رعنائی کہاں!

گاڑی تُھن جھیل کے گرد چکّر کاٹ رہی تھی کبھی کوئی سُرنگ نظارے میں مخُل ہو جاتی۔ بادل پوش چوٹیاں، درختوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوانیں، جھیل کا حسین چہرہ دکھانے کے لیے گاڑی ایک طرف جھک گئی، نہرِ آب سنگریزے صاف نظر آرہے تھے،

ڈھلتے سورج کی کرنیں پانی کو سیمابی کیفیت بخش رہی تھیں جیسے منجمد سطحِ آب سرما کی اسکیٹنگ کے لیے تیار ہو۔ یکدم منظر بدل گیا اور وادی کتاب کی طرح کھل گئی، سُرخ سیبوں سے لدے ہوئے درخت، پربت کے گوشوں سے پھوٹتی سبک آبشاریں، پانی کے جھرنوں اور ننھی ندیوں کے میان گاڑی خراماں خراماں چلی جارہی تھی، کسمساتی لہریں، دُودھیا جھاگ، آبِ رواں اور برقی ریل، وادیوں، پہاڑوں اور جنگلوں میں ریل کی سیٹی گونج رہی تھی، اُس کے چلنے کا انداز جیسے مسافر کو لوری دے رہا ہو۔ گلیشیر کا شفاف پانی ہمارے ساتھ بہہ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو تمہیں جانے کی جلدی ہے، تم سمجھتے ہو گاڑی کی رفتار مجھ سے تیز ہے لیکن ازلی حسن تو میری وراثت ہے، دو ماہ تک پہلی برف باری ہوگی تو کیا، چاند کی روشنی میں برف پوش منظر بھی حسین ہوتا ہے۔ پوہ ماگھ کی بے نور طویل راتوں میں میرے منجمد جسم کا فطرت کے سوا کوئی ساتھی نہیں ہوتا، پھر آغازِ بہار میں گداز کی کیفیت، انجماد سے گداز تک، زمہریر سے حدت تک تم کیا جانو کتنی منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں۔ یہ منظر ہوشربا تھا، شاعر کا تخیل، مصور کا خواب، گردوپیش کی رعنائیاں سمیٹتی ہوئی گاڑی آگے بڑھ رہی تھی، جنگلوں میں مڑتی ہوئی پُراسرار پگڈنڈیاں کہیں گم ہوجاتیں، کبھی وادی آغوش وا کر دیتی کبھی یہ نظارہ پہاڑ کی اوٹ میں سو جاتا، نظارے کی دلربائی نے مجھے مسحور کرلیا، بے نام درختوں کے پیارے جنگل مجھ پہ یورش کر آئے، گرجوں کے چمکتے ہوئے کلس، جنگل کی مہک، میرے قدموں میں آبِ رواں، میرے کانوں میں گاڑی کی گونج، ایسے سمے ماسوا کو بھول جانا ممکن تھا، اپنی آرزو کے ساتھ تنہا رہ جانا ممکن تھا۔

زندگی کا ایک ایسا لمحہ یاد آگیا جس کی دلفریبی ہاتھ میں آکے نکل گئی تھی، اسلام آباد کے مطار پر اُترنے سے پہلے بھاری بھرکم ٹرائیڈنٹ بادلوں کی جھیل چیر کے نیچے آیا تو سحاب کا عکس وادی پہ پڑ رہا تھا، جھٹپٹا تھا اور پوٹھوار کی حسین وادی اُودے رنگ

میں نہا گئی تھی ــــ اُفق سے اُفق تک ــــ

پریوں اور جنّوں کی آماجگاہ کا طلسماتی منظر جس کی بچپن سے تلاش تھی نظر کے سامنے تھا، فردوسِ گم گشتہ کا ایک ورق، شاداب کھیت، سرسبز ٹیلے، چمکتی ندیاں، کچے کوٹھوں سے اُٹھتا ہوا دھواں، چراگاہوں سے پلٹتے قافلے وہ بے زبانوں کے، پوٹھوار کے کوی اِن روح پرور نظاروں سے آشنا ہوں گے، فطرت کا حُسن بھی کیا چیز ہے جو شاعر کو زبان اور مصوّر کو رنگ عطا کرتا ہے، لیکن کائنات کی رنگینیاں سیماب پا ہیں، انہیں مقیّد کر لینا اپنے بس کی بات نہیں، ٹُک دیکھ لیا دل شاد کیا.......

ٹُسرن سوئٹزرلینڈ کی سب سے خوبصورت جھیل ہے۔ اسٹیمر میں بیٹھے تو چو خانہ جھیل کا ایک حصّہ نظر آرہا تھا۔ خوابوں کی اس دنیا میں رنگا رنگ کے دوہرے بادبان والی پچاس ساٹھ کشتیاں تیر رہی تھیں، دخانی کشتی سطحِ آب پر بے تکان جا رہی تھی۔ جب تلاطم ہوتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے اصیل گھوڑے پر سواری کر رہے ہوں۔ چند لمحوں میں کشتی وسیع پانی میں داخل ہو گئی۔ کبھی کوہ پائیلٹس کی چوٹی پر اودے بادل گھر آتے اور وہ فاختئی رنگ میں رنگی جاتی، کبھی سفید بادل سے چھنتی ہوئی روشنی برف کو چاندنی میں نہلا دیتی، پھر بادل سرک جاتے اور سورج چوٹی کو منوّر کر دیتا، بادلوں کی عارضی یورش اور پسپائی سے ایک رنگ آتا ایک جاتا، "اُف کیا نظارہ ہے!" کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

جھیل کے کنارے ہر مکان کے عقب میں کشتی کے لیے ذاتی "گیراج" تھا، جہاں پانی اندر تک آ جاتا تھا، پہاڑ کی چوٹی پر چھ سو برس پرانا قلعہ آسٹریا نے سوِس SWISS کو مطیع کرنے کے لیے بنایا تھا، جنگِ آزادی میں سوِس نے دشمن کا مقابلہ شہتیروں اور پتھروں سے کیا، تین طرف بلند عمودی چٹانیں اور چوٹی پہ ہوٹل حسن بن صباح کے

قلعہ الاموت کی یاد دلاتا تھا۔ صرف ELEVATOR سے وہاں تک پہنچ سکتے تھے۔

سوئس ہمسفر نے کہا "ہم پانی سے بافراط بجلی پیدا کرتے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران کوئلہ حاصل کرنے میں دقت ہوئی تو ہم نے بجلی سے گاڑی چلانی شروع کی، یہ تجربہ کامیاب رہا، آہستہ آہستہ دُخانی انجن معدوم ہونے لگے، آج سارے ملک میں برقی ریل کا جال بچھ رہا ہے "۔

اقبال کو حسرت تھی:

دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

وہ حسرت پوری ہونے کے موقعے یہاں بے شمار تھے، سرسبز ڈھلوان پہ گھروندے یوں رکھے تھے جیسے لڑھک جائیں گے، درختوں کے جھُنڈ میں گھری تنہا کاٹیج اپنی سُندرتا میں مگن تھی۔

جھیل کے کنارے سفید اور پیازی شگوفوں سے لدے ہوئے درخت، رُخسارِ زمین پہ رنگین پتیوں کی چادر، قبرستان آتشیں اور نارنجی پھولوں سے پٹا پڑا تھا اُس پہ نظر پڑتے ہی پریم ساگر سُود کی یاد آئی جو چند برس قبل بڑے تلطّف سے پیش آیا تھا۔ اُس کے بغیر سوئٹزرلینڈ اُداس تھا۔ سُود سے ہماری جان پہچان تک نہ تھی لیکن وہ نواز کا دوست تھا اور ہم نواز کے دوست تھے۔ اتنی ہی قدرِ مشترک تھی لیکن اُس نے مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھّی۔

جنیوا میں ہر قسم کے مواقع میسّر تھے لیکن سُود نے بڑی محتاط قسم کا عشق کیا تھا۔ وہ سال ہا سال جینزل کو پرکھتا رہا۔ زندگی بھرپور ریلے کے ساتھ آئی اور گزر گئی۔ اب سُود کی آنکھوں میں حسرت و واماندگی کی نمود تھی جیسے آغازِ خزاں میں سبز پتیوں پر زردی کی پہلی دھاری کھِنڈ جائے۔ جینزل انتظار کرتی رہی اُسے آشا تھی ایک روز سُود جان جائے گا کہ اُس کی محبّت سچّی اور بے لوث ہے، پھر خبر آئی کہ سُود ایئر انڈیا کے اُس جہاز میں سفر

کر رہا تھا جو ماؤنٹ بلانک سے ٹکرا کے پاش پاش ہو گیا! فلاسفر ہیوبر لکھتے ہیں، انسان کا ہاتھ دو جیبوں کی طرف بڑھنا چاہیئے، ایک جیب میں یہ عبارت ہو "یہ سب کچھ میرے لیے ہے، میرے لیے ہی جہان کی تخلیق ہوئی" اور دوسری جیب میں "مَیں مشتِ خاک کے سوا کچھ نہیں"!

یہ کاروانِ رنگ و بو گزشتنی ہے، شگوفے مُرجھا جائیں گے، پتّیاں ہواہیں منتشر ہو جائیں گی، برف پگھل جائے گی، رُوح تابندہ رہے گی یا کُہرا کی مہین چادر اُسے بھی لپیٹ میں لے لے گی؟ اُداس سائے کی طرح جو گرہن کے وقت چاند پہ چھا جاتا ہے۔

گرائنڈل والڈ جانے کے لیے انٹرلاکن گاڑی بدلنی تھی، مَیں ٹیلی فون بُوتھ سے برن میں ایک دوست سے بات کرنی چاہتا تھا۔ مشین میں سکّے ڈال دیئے لیکن کامیابی نہ ہوئی، رائفلیں اور ہیوررسیک سنبھالے فوجیوں کا ایک دستہ پلیٹ فارم پر گاڑی کا منتظر تھا۔ ایک سارجنٹ نے مشکل حل کی، چیک کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک سکّہ کم ڈالا تھا، اُس نے کمی پوری کر دی، میں نے سکّہ لوٹانا چاہا لیکن سارجنٹ نے مُسکرا کر انکار کر دیا، گاڑی آنے میں کچھ دیر تھی، جینر سے عسکری تربیّت کے متعلق بات چل نکلی، سوِس خارجہ پالیسی کی بنیاد غیر جانبداری پر ہے مگر اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے قوم پورے طور پر مسلّح ہے، ابتدائی تربیّت حاصل کرنے کے بعد ہر شخص چھتیس برس کی عمر تک مختصر نوٹس پر دفاعی ضروریات کے لیے بلوایا جا سکتا ہے، ہر سال تین ہفتے فوجی مشقیں ہوتی ہیں۔ جینر نے کہا "عسکری تربیت کے علاوہ شہریت اور مساوات کے اصول سیکھنے کے لیے عسکری مشقوں کی بڑی اہمیت ہے۔ مثال کے طور پر ایک معمار کی دوستی بینک کے منیجر سے ہو سکتی ہے۔ ایسے تعلقات تا عمر قائم رہتے ہیں۔ مجھے رائفل اور مشین گن گھر لے جانے کی اجازت ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر کیل کانٹے

سے لیس ہو کر آؤں ۔ یوں بھی رائفل کی نشانہ بازی قومی کھیل ہے جس کے مقابلے اسکول میں شروع ہو جاتے ہیں"۔ جینیز چلا گیا تو میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ہمارے ملک میں یونیورسٹی ٹریننگ کور ایسا بے ضرر پروگرام بند کر دیا گیا جو کالجوں میں ۱۹۳۰ سے رائج تھا۔ یونیورسٹی ٹریننگ کور نقلی، تربیت سہی لیکن اس کی بھی افادیت تھی ۔

چھوٹی گاڑی کی قدرے اُونچی نشست آرام دہ نہیں تھی۔ مقصد یہ تھا کہ مسافر بیٹھے بیٹھے باہر کا نظارہ دیکھ سکیں۔ بلندی پر چڑھتے ہوئے دندانے دار پہیئے کی کِلک کِلک صاف سنائی دے رہی تھی ۔ یہ پہیہ درمیان میں تیسری پٹڑی پر چلتا ہے تاکہ گاڑی لڑھکنے نہ پائے ۔ سوِس ورزش کے رسیا ہیں، پہاڑ پہ چڑھنے کے لیے بھاری جُوتے پہنے یا اسکینگ کا سامان سنبھالے مرد، عورتیں، چھوٹے، بڑے اپنی اپنی منزل کی جانب رواں تھے ۔

گرائنڈل والڈ ہوٹل کی محفلِ ناؤنوش میں بڑے میاں جانِ محفل تھے ۔ پرانے قصّے، خوش گپیاں، بلند قہقہے، کاگ کھلنے کی آوازیں، شراب کے جام کھنک رہے تھے ۔ کمرہ کثیف دھوئیں سے بھرا تھا، بڑے میاں ستّر کے پیٹے ہوں گے صبح ناشتے کے وقت ملاقات ہوئی تو سانس کی دھونکنی چل رہی تھی ۔

"آپ کا کمرہ آرام دہ ہے ؟"

"بہت آرام دہ"۔

"اگلے سال بھی یہیں ٹھہرنا، بڑے ہوٹلوں والے ٹھگ لیتے ہیں"۔

بڑے میاں آپ دنیا دار آدمی ہیں، فیملی بزنس آپ کے ہاتھوں پروان چڑھا ہوگا لیکن میں کہاں کا لکھ پتی ہوں کہ ہر سال تفریح کے لیے اِدھر آنکلوں گا ۔

"کہیئے کہاں کے ارادے ہیں ؟"

"خیال تھا وینگن کی سیر ہو جائے"۔

"کیبل کار اسٹیشن سے وینگن صاف نظر آتا ہے، وہاں تک پیدل ہو آؤ"۔

دہاں پہنچ کے سوچا یہ کیا بات ہوئی کہ کیبل کار چند منٹ میں وینگن پہنچا دے۔ اُترائی کیا مشکل ہوگی لیکن پگڈنڈی دشوار گذار تھی، ایک تہائی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ احساس ہوا ایک طرف گہری کھائی ہے۔ اُوپر دیو آسا مہیب چٹانیں منہ کھولے کھڑی ہیں۔ نیچے دیکھنے سے ہَول آتا تھا۔ دل میں وسوسہ گزرا کہیں غلطی تو نہیں کی لیکن لوٹ جانا بھی دانشمندی نہ تھی، فرار کی سب راہیں مسدود تھیں، وہ تو خیر گزری کہ موسم اچھا تھا۔ بارش ہوتی تو شیخی کرکری ہو جاتی۔ آئے تھے لونج سُوٹ اور نفیس جُوتے پہن کے کوہ پیمائی کرنے۔

پہاڑی راستے نے منہ چھپا لیا تو مرغزار کی گھاس پہ قدم پڑنے لگے۔ صنوبر کے جنگل کی مہک چار سُو تھی، وادی کے خدوخال واضح ہونے لگے تھے۔ چراگاہوں سے لوٹتی ہوئی بھیڑوں کی غنائی گھنٹیاں بج رہی تھیں، وادی میں وینگن شرمائی ہوئی دُلہن کی طرح دمک رہا تھا۔ نکھرے ہوئے گھر، چمکتے تالاب، پُرسکون ماحول، جنگل کی سائیں سائیں، دفعتاً گرجے کا گھنٹہ بجنے لگا۔ اُس کے ارتعاش سے وادی گونجنے لگی۔ وسیع وادیاں، پہاڑ اور بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلنے والا سُورج، ایک مصوّر کو تصویر کشی کے لیے خُوب تر منظر ملنا دشوار ہوتا۔ ایک خاتون نظارے سے محظوظ ہو رہی تھی۔ "مجھے عرصے سے جوڑوں کا درد ہے، میں ہر سال اِن دنوں یہاں آتی ہوں تاکہ ازلی حُسن اپنے درد میں سمو سکوں!"

کلیسا کا گجر بالآخر ختم ہوا، پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ ہوا کی سرسراہٹ تک محسوس ہو رہی تھی، تازہ گری ہوئی برف جیسے پہاڑوں کو قلعی کر دی گئی ہو۔ وینگن میں دُنیا کی آسائشیں میسّر ہیں۔ بجلی، ٹیلی فون، سنٹرل ہیٹنگ، پُرتکلّف ہوٹل، معیاری کیفے اور گھڑیوں سے بھرپور دکانیں۔ لیکن مجھے وہاں لَوٹ کے جانا ہے جہاں عُسرت و ناداری ہے، جہاں قسمت پہ شاکر ہو جانا زندگی کا دوسرا نام ہے۔

کالام میں بھی چیڑ کے جھنڈ اور فلک بوس چوٹیاں تھیں۔ وہاں بھی پانی کا تیز بہاؤ

سڑک کا ساتھ دیتا تھا اور فرازِ کوہ سے اُترتی ہوئی آبشار ہرنی کی طرح چھلانگ لگاتی ہوئی بڑے بڑے پتھروں پہ آرہی تھی لیکن لوٹ جاتی ہے اِدھر کو بھی نظر کیا کیجئے، وہیں خانہ بدوش قافلے نے ڈیرے ڈالے تھے، عورتیں سامان ڈھو رہی تھیں۔ غربت اور بے بسی کا یہ عالم کہ بیٹیاں بیچنے پر مجبور، تیز رفتار گاڑیوں سے بے نیاز ایک شخص اکتارہ بجاتا جا رہا تھا، "پھیکا رنگ" کرتا، گھسا ہوا مونج کا چپل، بکھرے بال، ناتراشیدہ ڈاڑھی وہ اکتارے کی آواز میں مست اپنے رستے پر چلتا رہا، اتنے میں ایک نوجوان چرواہا ٹیلے سے کود کے سڑک کے درمیاں آرہا اور بھیڑوں کو ایک طرف ہانکنے لگا، گھٹنوں تک پرانے کمبل کی پوشش، اُسی کپڑے کی صدری اور گول ٹوپی، پاؤں میں چھیتڑوں کے جوتے! وہ اُردو صاف بولتا تھا، ڈیڑھ برس کراچی میں کام کیا لیکن وہاں جی نہیں لگا" ہمارے ہاں جاڑوں میں مویشیوں کے لیے گھاس نہیں ہوتی، ہم جانوروں کو لیے میدان میں آجاتے ہیں، دن بھر دس پندرہ میل چل لیے، جہاں پانی مل گیا پڑاؤ کر لیا۔"

سایہ و چشمہ و صحرا دمِ عیشی دارد

گندم کی فصل کٹ چکی تھی، سنہرے خوشوں کے گٹھے بندھے پڑے تھے، کچھ دانہ الگ کرنے کے لیئے کوٹے جا رہے تھے ننھی کیاریاں، چھوٹا کھلیان، رومانوی منظر اور بھوک، بے کار لوگ، اَن پڑھ بچے، فاقہ مستی اور تبدیلی، ایک پیوند کہاں ختم ہوا دوسرا کہاں شروع ہوا۔

درد وہ سنگِ گراں ہے کہ پگھلتا ہی نہیں

فطرت کا حسن اپنے درد میں سمو لینے والی خاتون کو یہ مسئلہ درپیش نہ تھا۔

غمِ عالم فراواں ست و من یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگِ بیاباں را (اورنگزیب عالمگیر)

اگلے روز دو ڈبوں والی گاڑی جنگ فراکی طرف رینگ رہی تھی۔ گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر یہ دُنیا میں سب سے اُونچا ریلوے اسٹیشن ہے، ملحقہ سُرنگ سے نکلتے ہی آپ گرم ہوٹل میں قدم دھرتے ہیں، ایک طرف شیشے کی دیوار ہے تاکہ سیلانی سولہ میل لمبے الیش گلیشیر کا نظارہ کرسکیں، ریستوراں میں گرم کھانا سادگی کے باوجود لذیذ تھا خوراک کے دام ہر جگہ ایک سے تھے، یہ اور بات ہے کہ زرِمبادلہ کی وجہ سے بل کی ادائیگی شاق گزرتی تھی! اس وقفے میں برف باری ہوتی رہی تھی، واپسی کے لیے پلیٹ فارم پر آئے تو گارڈ نے مژدہ سُنایا۔

"بہت برف پڑ چکی ہے، مجھے افسوس ہے گاڑی اگلے اسٹیشن تک نہیں جاسکے گی، آپ کو ڈیڑھ میل کا فاصلہ پیدل طے کرنا ہوگا!"

ہمارے قافلے میں ایک انگریز جوڑا مع دو بچیوں کے، ایک کیوبن اور ایک خوش گپ امریکن بزرگ شامل تھے۔ دلکشی کے باوجود برف باری کا منظر افسردگی کا پہلو لیے تھا، شاید ہر خوبصورت منظر میں افسردگی کا شائبہ ضرور ہوتا ہے۔ دُھنی ہوئی روئی ایسے گالے ہماری جدوجہد سے بے خبر، ہمارے رنج و غم سے بے خبر، دھیرے دھیرے زمین کی طرف آرہے تھے جیسے فضا میں معلق ہوں، کوئی جلدی نہ ہو۔ ٹہنیاں پتوں سے یکسر عاری تھیں لیکن عریاں نہیں، برف کی دبیز تہہ اُن پر جم گئی تھی۔ یہ منظر کرسمس کارڈ کی یاد دلاتا تھا۔ وہی دُھندلکے اُجالے میں برف پوش کٹیا، برف باروں کے بوجھ تلے جُھکی ہوئی شاخیں، فطرت کی الہڑ دوشیزگی و معصومیت کی تصویر! اور میں نے سوچا اگر تطہیر اور پاکیزگی کے اس مرقّع کو اپنے رگ و پے میں سمولوں تو شاید میری رُوح کے داغ دُھل جائیں لیکن یہ سودائے خام تھا، روپہلی طلسم جلد ٹوٹ گیا۔ وہ طوفان کہ الامان والحفیظ! برف کے باریک ذرّے تُند جھکڑ کی شکل اختیار کر کے اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے، ذرّوں نے نتھنوں اور پائینچوں میں گُھسنا شروع کیا

تو مجھے ملتان کی لُو یاد آگئی، کون کہتا ہے کہ ٹھنڈا دوزخ نہیں ہو سکتا۔ ہم پٹڑی کے ساتھ پھُونک پھُونک کر قدم رکھ رہے تھے، ذرا پاؤں ہٹا اور برف میں دھنس گئے، میں ٹوپی ہوٹل میں بھُول آیا تھا جو میری حماقت تھی، بار بار رومال سے سر خشک کرنا پڑتا، ایک ہاتھ سے مَیں نے انگریز بچّی کو تھاما ہوا تھا جسے چلّاتا چھوڑ کر اُس کے والدین آگے بڑھ گئے تھے۔ ڈیڑھ میل کا سفر خُدا خُدا کر کے ختم ہوا۔

سوئٹزرلینڈ تسخیرِ فطرت کی زندہ مثال ہے۔ پہاڑوں کا سینہ چیر کر سُرنگوں اور سڑکوں کا جال بچھایا گیا، آبشاروں کو مطیع کر کے ریل اور صنعت کے لیے بجلی پیدا کی گئی۔ معدنیات نام کو نہیں، کاریگروں کی صنّاعی ملک کی اصل دولت ہے جس کے طفیل صنعت کے میدان میں حیرت انگیز ترقّی ہوئی ہے۔ سوِس محنت کے عادی ہیں، اُن کا ایمان ہے کہ دنیاوی نعمتیں ایمانداری اور محنتِ شاقہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں، نسلی طور پر یہ مُلک جرمن، فرانسیسی اور اطالوی خِطّوں میں بٹ سکتا ہے۔ یونہی لسانی اعتبار سے تین زبانیں بولی جاتی ہیں، اس کے باوجود سوِس سات صدیوں سے اپنی قومیت برقرار رکھے ہوئے ہیں، طُرّہ یہ کہ یورپ میں روایتی طور پر ایک دوسرے کے دشمن ــــــ جرمن اور فرانسیسی ــــــ سوئٹزرلینڈ میں گھُل مِل کے ایک قوم ہو گئے ہیں۔ انہوں نے LIVE AND LET LIVE کا اصول اپنایا ہے۔ گاڑی میں ایک سوِس نے بتلایا تھا کہ سرکاری ملازموں کو تینوں زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں، دفتر میں آپ کو ایک خط یا تار جرمن یا فرانسیسی میں ملے تو آپ کی صوابدید پہ ہے کہ اُس کا جواب جرمن یا فرانسیسی میں دیں یا اطالوی میں۔

کانٹن یا صوبے بڑی حد تک خود مختار ہیں اور اپنے معاملات میں مداخلت برداشت نہیں کرتے، چند کانٹن میں اب تک سال میں ایک بار کھُلی فضا میں میٹنگ ہوتی ہے جہاں ووٹ دہندگان اپنی رائے کی بالادستی کا اعادہ کرتے ہیں۔ صنعتی ترقی اور

یورپی مشترکہ منڈی کے قیام سے کچھ مشکلات پیدا ہوئی ہیں اور مرکزی حکومت کو ایسے فرائض سنبھالنے پڑے ہیں جو صوبائی حکومتیں سرانجام نہیں دے سکتیں، سوئٹزرلینڈ آزادانہ تجارت کا علمبردار ہے جب دو ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے تو سوِس طرفین کو اسلحہ بیچتے ہیں اور کاروباری نقطہ نظر سے اسے قبیح نہیں سمجھتے۔

سوِس یہ بات خوب سمجھتے ہیں کہ اپنے ملک سے باہر ہر شخص بہترین معیار کی توقع رکھتا ہے۔ وی وے ہو یا جِننگ فراخوش گوار ماحول میں ایک آرام دہ کمرہ آپ کو مل جائے گا۔ وی وے میں جہاں میں نے ایک رات گزاری اُسے ہوٹل نہیں کہہ سکتے تھے، نیچے ریستوراں، اُوپر تین چار بے ڈھب کمرے اور ملحقہ غسل خانے لیکن اِردگرد تازگی کی مہک تھی، وہ سِل اور بساند عنقا تھی جو بارشوں میں مری سے منسوب ہے۔

ہر جگہ پھُول ہی پھول تھے، کھڑکیوں سے لٹکتی ہوئی پھُولوں کی ٹوکریاں، پلیٹ فارم پر خوش رنگ پھُولوں کے بڑے بڑے گملے، ریلوے سائیڈنگ پر پھولوں کے گلدستے! ملک بھر میں ماحول صاف ستھرا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے ہر شہر ہر قریہ اس صفائی پر نازاں ہے۔

جھیل کا کنارا ہو یا پہاڑ کی چوٹی، سیالِ برف کا دریا ہو یا حسین وادی مواصلات کا سلسلہ ایسا ہے کہ سیّاح آسانی سے ہر جگہ پہنچ سکتا ہے۔ یہاں ہر منظر دِلرُبا ہے، ہر گھر اقامت گاہ ہے، منظر اور گھر مہمان کے منتظر ہیں، یہ اور بات ہے کہ مسافر کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔

تو رہ نوردِ شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول

اور سوِس جیسے کہہ رہے ہوں " میاں ایک نظر دیکھ کے اپنا راستہ لو، یہ ملک ہمارا ہے، تمہارا فلسفہ کہ یہ بنی آدم کی میراث ہے اور یوں مشترک ہے درست ہو گا

لیکن یہ ہمارے حصے میں آیا ہے، ہم نے اسی لیے ہر ہوٹل اور مہمان خانے پر سوِس نشاں نصب کر دیا ہے۔"

اگلی منزل کولون تھی جہاں منصور میاں 'سلپ ڈسک' کے آپریشن کے بعد صحت یاب ہو رہے تھے۔ گیتی کی ساڑھی دیکھ کے سرجن کی معاون نے اندازہ لگایا کہ شوہر کوئی راجہ یا نواب ہوگا، چنانچہ ایک کثیر رقم طلب کر لی، جب منصور اس کے متعلق سرجن سے ملے تو اُس نے اقرار کیا کہ معاون کو غلط فہمی ہوئی تھی " خیر اب تو بل بن چکا!" مَیں نے سوچا یہ تو اپنے ہاں کی کہانی معلوم ہوتی ہے! لیکن یہاں گیتی کو انسانی ہمدردی کا انوکھا تجربہ ہوا، یونیورسٹی کلینک کے باہر "کھوکھا" سا تھا جسے خوبصورت کنزل چلاتی تھی۔ اُس نے گیتی کو تنہا اور اُداس دیکھ کر اشاروں سے پوچھا، تم جب یہاں سے گزرتی تھیں تو تمہارا خاوند ساتھ ہوتا تھا، وہ کہاں ہے؟ آپریشن؟ ہائے بے چاری اجنبی لڑکی۔ مُلک کی زبان تک نہیں جانتی، تم اس شہر میں تنہا ہو؟ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھانا، میری دکان سے جو چیز چاہو لے لو۔ چاکلیٹ، کوفی، بسکٹ، پھل؟ تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی، میرا سویٹر لے جاؤ پھر لوٹا دینا، میرے ہاں آکے کپڑے استری کر لیا کرو۔ وہ گیتی کی سہیلی بن گئی، اپنا اسکارف تحفے کے طور پر دیدیا، یہ کبھی نہیں ہوا کہ منصور اور گیتی جرمنی جائیں اور کنزل کو مِل کے نہ آئیں۔

ہوٹل کے منیجر سے ڈوسل ڈورف جانے والی گاڑیوں کے اوقات پوچھے تو اُس نے تعجب سے سر اٹھایا "جی؟ صرف کھانا کھانے کے لیے ڈوسل ڈورف جا رہے ہیں؟" وہاں پہنچے تو رات کے نو بج رہے تھے۔ باغات، چوک، کشادہ سڑکیں، نئی طرز کی عمارتیں، دھیمی پھوار میں ڈوسل ڈورف جگمگ جگمگ کر رہا تھا، بمباری سے بڑی تباہی ہوئی تھی لیکن جذبہ ہو تو ایسا نیا شہر کہیں زیادہ خوبصورت تھا۔ دکانیں ہر قسم

کے سامان سے پُر تھیں۔ SHOW WINDOWS کی آرائش دکانداروں کی نفاست اور سلیقے کا پتہ دیتی تھیں۔ دیدہ زیب چیزوں کی داد دیئے بغیر آگے بڑھنا محال ہو رہا تھا۔
ترقی کی یہ منزل گفتار کے غازیوں نے نہیں کردار کے غازیوں نے سخت کوشی اور سعیِ پیہم سے حاصل کی ہے۔ میرے سوال کے جواب میں کولون یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے کہا تھا "جب ہمیں شکست ہوئی اور جرمنی مسمار کر دیا گیا تو ہم نے سمجھا تھا کہ ہمارے لیے سب کچھ ختم ہو چکا، ہم ایسے تباہ ہوئے ہیں کہ کبھی نہ اُٹھ سکیں گے، پھر ہمیں اپنے بچّوں کا خیال آیا اور اُن کے بچّوں کا جنہوں نے اس خطّے میں زندگی گزارنی ہے۔ بس اس خیال سے ہم کمر بستہ ہو کر وطن کی تعمیر کے لیے میدان میں آ گئے۔"

دس بجے ہنگرین ریستوران پہنچے، گولاش کے شوربے میں ہمارے سالن کا مزہ تھا۔ پاکستانی کھانوں میں اتنی مرچ نہیں ہوتی جتنی ہنگری کی خوراک میں۔ پرانی وضع برقرار رکھنے کے لیے لکڑی کی معمولی میز کرسی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کرسی کی سیٹ بھی لکڑی کی تھی۔ میز پر جگہ جگہ لوگوں نے نام کندہ کر رکھے تھے، بجلی ندارد، دھواں دار چراغوں سے چھت کے موٹے شہتیر سیاہ ہو چکے تھے۔

ریستوران میں شائقین کا ہجوم تھا، ہمیں بمشکل جگہ مل سکی۔ مغربیت کا ملمّع ایسا ہے کہ پاکستان میں ایسی جگہیں فیشن ایبل نہیں سمجھی جاتیں لیکن اہلِ مغرب پرانے طور طریقوں پر نازاں ہیں، وہ ایسے ریستوران میں شوق سے جاتے ہیں جہاں پرانے ماحول میں خاص قسم کا کھانا مل سکے۔

ہنگری نژاد چی کوش نے ڈوسل ڈورف کے پرانے شہر میں یہ ریستوران کھولا تھا۔ کھانا مزے کا تھا، دنوں میں کاروبار چل نکلا۔ دیکھتے دیکھتے چی کوش امیر بن گیا۔ اُسے اپنا سائیکل پسند تھا، کار نہیں خریدتا تھا۔ دوستوں کے اصرار پر وہ یہی جواب دیتا "جرمنی میں بڑی امارت ہے، ہر قصاب کے پاس مرسڈیز ہے لیکن میرا سائیکل بھلا۔"

آخر احباب کی جیت ہوئی، چی کوش نے ڈرائیونگ لائسنس لے کے کار چلانی شروع کی لیکن دس روز میں ہی بے چارے کو حادثہ پیش آگیا اور جان سے گیا، اب اُس کی بیوہ کاروبار چلاتی ہے۔

ریستوران سے نکل کر ہم زیر زمین سرنگ سے ایک بڑی شاہراہ عبور کر رہے تھے، سرنگ میں اطالوی رنگساز رنگ کرتے ہوئے سیٹی بجا رہا تھا۔ جرمن ایسا کام کرنے سے کترانے لگے ہیں جس میں آلائش کا ڈر ہو یا کان کنی کی طرح سخت محنت کرنی پڑے، کچھ کام مشین کے سپرد کر دیئے گئے ہیں، کولون کے ڈاک خانے میں "طلسماتی آنکھ" نصب ہے جو ایک منٹ میں ایک ہزار خطوط مختلف خانوں میں پھینک دیتی ہے۔ ہر شہر کے لیے الگ خانہ ہے۔ ہر خط پہ نہ صرف شہر کا نام لکھا ہے بلکہ اُس کا نمبر بھی۔ "طلسماتی آنکھ" نمبر دیکھ کے خط متعلقہ خانے میں پھینک دیتی ہے۔ مشین بغیر نمبر کے خط کو رد کر دیتی ہے۔ لڑکیاں منتظر رہتی ہیں کہ ایسے خط پر نمبر ٹائپ کر کے گردش کناں پیٹی پر رکھ دیں۔ اپنے ملک میں رائج کرنے کی غرض سے امریکی یہ مشین دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ کاروں کی تیز رفتاری بھی راڈار کے ذریعے چیک ہوتی ہے۔ راڈار رفتار ناپ لیتا ہے، کار کے نمبر پلیٹ کی تصویر کھینچ لی جاتی ہے تاکہ تیز رفتاری سے 'منکر' ہونے والے کے خلاف شہادت مہیا ہو سکے۔

اسٹیشن واپس جاتے ہوئے ہمارے قدم آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ دکانوں میں دھری ہوئی جاذب چیزوں پہ نظر پڑتی تو اپنے ساتھیوں کو دکھلاتے، چند لمحوں کی تاخیر سے کولون جانے والی گاڑی چھوٹ گئی، ٹیمپو ٹیمپو جلدی جلدی ٹکٹ چیکر نے کہا لیکن ساڑھی سنبھالتی ہوئی خواتین ابھی پچھلے پلیٹ فارم پر تھیں کہ گاڑی سرکنی شروع ہو گئی۔

"اگلی گاڑی مس کرنے میں کتنا وقت باقی ہے!" زہرا نے پوچھا۔

رات کا ایک بج رہا تھا لیکن ڈوسل ڈورف میں زندگی جاری وساری تھی۔

اسٹیشن کے کیفے میں کوفی پیتے ہوئے ہم اپنی حماقت پہ ہنس رہے تھے کہ نشے میں دُھت ایک معمر شخص ذرا زور سے کہنے لگا "میرا اوور کوٹ کہاں ہے ؟" پھر ہمارے قریب آکر جرمن زبان میں پوچھنے لگا "گھر میں سب خیریت ہے نا ، آپ کی طبیعت اچھی ہے ؟" جب فرسٹ کلاس ریستوران والوں نے نکال دیا تو اُس نے سیکنڈ کلاس ریستوران میں پناہ لی ، جرمن شرابی کی حرکات پر شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھے تھے ۔ معلوم ہوا صبح دو بجے پولیس ایسے بے مقصد گھومنے والوں کو اُن کے گھر پہنچا دیتی ہے ۔

کولون جانے کے لیے ہمیں کوپن ہیگن ۔۔ اوسٹنڈ ۔۔ پیرس ایکسپریس ملی جو مغربی یورپ کی ہم آہنگی کا اعلان کر رہی تھی ، رسل و رسائل اور تجارت پہ کوئی قدغن نہیں ، مغربی یورپ کے ہر مُلک میں اطالیہ کے جوُتے ، فرانس کے عطریات ، جرمن کراکری اور ہالینڈ کے چھُری چمچے دستیاب ہیں ۔

اگلے روز ہم میونخ کے گلی کوُچے گھوم رہے تھے ۔ عظیم چوک اور کشادہ گزرگاہوں میں پتھر کا فرش ، پرانی طرز کی عمارات ۔ ہٹلر میونخ کا دلدادہ تھا ۔ اُس کا کہنا تھا کہ شہر کی تعمیر میں جرمن کلاسیکی رنگ جھلکتا ہے ۔ ہاف فرا کے وسیع ہال میں اُس نے کئی بار نازی پارٹی کے ممبروں سے خطاب کیا ۔ ہاف فرا ہاؤس میں محنت کش بیر کے رطلِ گراں تیزی سے خالی کر رہے تھے ۔ گوشت اور لذیذ خوراک کی بڑی قابیں بھی اُسی سُرعت کے ساتھ صاف ہو رہی تھیں ، مزدور طبقہ کی خوش خوری اور اپنی کم مائیگی سے ہم نے اندازہ لگایا کہ مہنگائی کے باوجود کارکنوں کو معقول اُجرت ملتی ہے ، ہاف فرا ہاؤس میں ایک انجینئر سے ملاقات ہوئی ۔ اُس کی آپ بیتی کا ایک ورق جرمن قوم کے عزم و استقلال کا آئینہ دار تھا " جنگ کے بعد میونخ میں پولی ٹیکنیک کا پہلا کورس ۱۹۴۶ء میں شروع ہوا ، ہم تیس طالب علم تھے اور ایک اُستاد ۔ یونیورسٹی میں کوئی عمارت نہیں بچی تھی ، طلبا ملبے سے اینٹیں اُٹھاتے اور ہاتوڑے سے کھُرچ کے سیمنٹ علیحدہ کرتے ، یوں اپنے ہاتھوں سے

ہم نے دو کمرے بنائے اور پڑھائی شروع کی"۔ اب شہر کی درس گاہوں میں لاکھوں طلباء زیرِ تربیت ہیں، شوبینگ کا علاقہ اُن کا نام سے منسوب ہے جہاں دن بھر کے تھکے ماندے رقص و سرود کی محفلوں میں زندہ دلی کا ثبوت دیتے ہیں۔

کون ستارے چھو سکتا ہے
راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے (اختر الایمان)

مشرق سے کوئی اجنبی اِنسبرُک پہنچ پاتا ہوگا، راستے میں دل کش نظارے بکھرے پڑے ہیں۔

چشمہ دیکھا تو تھکا ماندہ مسافر ٹھہرا

کہیں رُک گئے تو وقت گزر گیا، فرصت کے لمحے فراواں نہیں، انسبرُک برفپوش پہاڑوں کے درمیان ایک وادی میں ہے جس کے بیچوں بیچ دریائے اِنسبہتا ہے، ریل کی پٹڑی دریا کے ساتھ ساتھ مڑتی ہے۔ رات کے وقت بلندی سے خوب نظارہ تھا۔ ریل کی روشنیاں شہر کی روشنیوں میں تحلیل ہو کر دریا میں منعکس ہو رہی تھیں۔ ریل کی سیٹی اس عظیم پیالے میں گونج رہی تھی، پہاڑوں میں کہیں دُور دھند میں لپٹا برقی قمقموں کا ہنڈولا تاروں کے جھرمٹ کی طرح جھلملا رہا تھا۔ اسکی اسٹیشن S. KI STATION سے ملحق ہوٹل بارہ مہینے کھُلا رہتا ہے۔ یہ ہوٹل ایک بارٹینڈر کی ملکیت ہے۔ شراب کے جام پیش کر کے اُس نے انعامات سے کثیر رقم پس انداز کر لی۔ پہاڑ پہ حصارِ سنگیں ٹاورُل کے کسی آرچ ڈیوک کی یادگار ہوگا۔ ہیپس برگ کا شاہی خاندان کثیر الاولاد تھا، ہر شہزادے کو زمین کا ٹکڑا عطا ہو جاتا تھا، دشمنوں کے علاوہ عوام کو مرعوب کرنے کے لیے ایسے قلعوں کا وجود ضروری تھا!

ٹائرول کی جنگِ آزادی اٹھارویں صدی کے اواخر میں شروع ہوئی۔ اُس میں

پندرہ برس کے بچے ستر سالہ بوڑھے، مرد عورتیں سبھی شامل تھے، لوگوں کے پاس رائفلیں نہیں تھیں۔ انہوں نے فرانسیسی فوج کا مقابلہ بیلچوں سے کیا، پہاڑوں سے بڑے بڑے پتھر لڑھکائے گئے تاکہ فرانسیسی سپاہی اُن کے نیچے دب جائیں۔ ۱۸۰۹ء میں اندریاس ہوفا نے یہ جنگ جیتی۔ وہ جنگِ حریت کی رُوح رواں تھا اور کسانوں کی بغاوت کا محرک، آج اطالوی اُس کا نام سُننا گوارا نہیں کرتے، کریں بھی کیسے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد وہ ٹائرول کے نصف حصے پر قابض ہو گئے۔ انزبرک میں جا بجا لکھ رکھا تھا "اقوام متحدہ مداخلت کر کے جنوبی ٹائرول کو اطالوی گرفت سے آزاد کرائے، ابتدائی جماعتوں میں ہمارے بچوں پر اطالوی زبان مسلط کی جاتی ہے، انہیں اپنی ثقافتی وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے"۔ انزبرک کے بڑے گرجے میں سنگِ مرمر کی تختی پر لکھا ہے "ٹائرول ایک لوح ہے، جنوبی ٹائرول آسٹریا کا ہے، ہمیں اپنے قومی جانباز اندریاس ہوفا کی ہڈیوں کی قسم جب تک اُسے حاصل نہیں کر لیتے چین سے نہیں بیٹھیں گے"۔

چٹانوں سے ٹکرا جانا زندگی ہے چاہے اُس کا انجام پاش پاش ہونے کے سوا کچھ نہ ہو، جلیل مقصد کی خاطر جان کی بازی لگا دینا ہی زندگی ہے، ہمارے شہدا بھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مسکرائے تھے، شوقِ شہادت میں زندگی کی وقعت پرِ کاہ سے بیش نہ تھی، زمانے کے محیطِ بیکراں میں انسان صرف ایک بار اس دُنیا میں آتا ہے لیکن اُن کے لیے لمحۂ عالیہ آن پہنچا تھا "عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں" منزل تک آن پہنچا تھا! اگر دِکار زار میں رُوپوش ہونے والے ستارے کہکشاں کی زینت ہوئے، اُنکے کارناموں کی یاد حرزِ جاں ہے لیکن زندہ قومیں شعلہ فروزاں رکھنے کے لیے یادگار بھی قائم کرتی ہیں، وہ سنگِ مرمر کی تختی ہو یا سینے میں عزمِ آہنی!

وہ زمانہ گزر گیا جب قوموں کی قسمت کا فیصلہ دی آنا میں ہوتا تھا، پہلی جنگِ عظیم کے بعد آسٹرو ہنگرین ایمپائر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا بڑا المیہ تھا، چیک اور ہنگرین چھوٹی

چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئے اور طاقتور ہمسایوں کے لیے تر نوالہ بنے، فتح کے بعد اتحادی شکست خوردہ حریفوں کے پر کاٹنا چاہتے تھے لیکن حقِ خود ارادیت کی مانگ اپنی جگہ پر تھی۔ تاریخ کے صفحات اقلیتوں کے خون سے سُرخ ہیں۔ جب لوگوں نے اپنا حق مانگا جابر حکومتوں نے اسے "بغاوت" سے تعبیر کیا۔

دورۂ جرمنی کے بعد ایک نامہ نگار نے جرمن ذہنیت کا تجزیہ کیا" یہ لوگ جنہیں روزمرہ کی زندگی میں آپ دکانوں اور ہوٹلوں میں ملتے ہیں وہی ہیں جنہوں نے نازیوں کے جرائم سے چشم پوشی کی تھی، احساسِ جرم آسیب کی طرح فضا میں موجود ہے چند لوگوں نے استبداد کے خلاف آواز اٹھائی لیکن جرمنوں کی کثیر تعداد نازیوں کی ہم نوا ہو کر ارتکابِ جرم میں شریک ہو گئی"۔ اُس زمانے میں نازیوں کی مخالفت کرنا دل گُردے کا کام تھا۔ لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے ہٹلر نے اجتماعی حبس گاہیں وسیع پیمانے پر استعمال کیں، دنیا جانتی ہے وہاں یہودیوں اور سیاسی مخالفوں پر کیا بیتی، ایک جرمن سارجنٹ کسی لالچ کے بغیر یہودیوں کی جان بچاتا رہا، بالآخر پکڑا گیا اور اُسے گولی مار دی گئی۔

اِنز برک کے کاریگر جھاڑ اور دیدہ زیب ٹیبل لیمپ بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے، ایک دُکان میں شیشے کا جھاڑ پسند آیا، دکان بند ہونے کو تھی اور زبان کی وجہ سے بل کی ادائیگی میں دقت پیش آ رہی تھی، ایک آسٹرین نے رضا کارانہ طور پر مشکل آسان کی اور شاپنگ کے بعد چائے کی دعوت قبول کر لی، مخمور یا باتونی ضرور تھا لیکن اس کی باتیں دلچسپ تھیں:۔

"طالب علمی کے زمانے میں مَیں نازی پارٹی کا ممبر نہیں تھا، لوگوں نے مجھ سے بات کرنی بند کر دی، کوئی ہم جماعت تنہا مل جاتا تو دل کی بات کہہ دیتا، سب کو معلوم تھا کہ لب کشائی مہنگی پڑ سکتی ہے، جنگ سے تین برس قبل میں لیپزگ گیا تھا، ٹریفک کے سپاہی نے مجھے لہجے سے پہچان لیا "تم آسٹریا سے آئے ہو؟ اپنے

ہم وطنوں کو بتلا دیتا کہ یہ جگہ جہنم کا نمونہ ہے"

چائے پیتے ہوئے تھوما نے اپنی بات جاری رکھی،

"آمر اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے ہیں لیکن اگر کوئی خطرہ مول لے سکے تو بہت سے احکامات ٹالے جا سکتے ہیں، جنگ کے دوران مجھے محاذ پہ بھیج رہے تھے، میں نے عذر کیا کہ میری ریڑھ کی ہڈی میں نقص ہے، وی آنا ہسپتال کا انچارج نازیوں کا حامی تھا، وہ تاڑ گیا کہ جنگ سے بچنے کے لیے میں نے بہانہ تراشا ہے، اُس نے حکم دیا کہ میرا طبیّ معائنہ کیا جائے، دوستوں نے میری ایکس۔رے پلیٹ ایک ایسے مریض کے ساتھ بدل دی جو تپدق میں مبتلا تھا، جنگ کے دوران میں ہسپتالوں کا مہمان رہا، کھانے کو اچھا ملتا تھا، شام کو کھیل تماشہ دیکھنے کے لیے چھٹی مل جاتی تھی۔"

تھوما کو اعتراف تھا کہ ایک چوتھائی آسٹرین ہٹلر کے دلدادہ تھے، بیشتر اِس لیے کہ وہ یہودیوں کا دشمن تھا! رُسوائے زمانہ ایشمین کے بارے میں تھوما رائے ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا "ایشمین قاتل تھا لیکن اُس پر مقدمہ چلانے کا حق صرف جرمنی کو تھا، ٹھگوں کی طرح دوسرے مُلک سے اُسے اغوا کرنا، پھر سزائے موت دینے کے لیے خاص قانون وضع کرنا کہاں کا انصاف تھا، اسرائیل کے ہتھکنڈے ہٹلر کے طور طریقوں کی یاد دلاتے ہیں۔"

دوسرے روز ہم پہاڑی راستے کے پیچ و خم طے کرتے ہوئے چوٹی پہ جا پہنچے، تھوما اپنی چوبی کاٹیج دکھلانے کے لیے مجھے یہاں لے آیا تھا۔

"آپ نے شادی نہیں کی؟" میں نے ننھّی کاٹیج دیکھ کے پوچھا۔

"کسی لڑکی سے دوستی رکھنا اور بات ہے، اگر شادی کر لُوں تو اُسے رکھوں کہاں؟ میں اپنی ماں کے پاس رہتا ہوں، کچھ بچتا بھی نہیں، آمدنی کا تہائی حصّہ ٹیکس کی نذر ہو جاتا ہے جو شاید یورپ میں سب سے زیادہ ہے۔" سرما کی آمد آمد تھی، تھوما آوزار

نکال کے چھت کی مرمت کرنے لگا اور میں اُس نظارے میں محو ہو گیا جو مظفر آباد کی یاد دلاتا تھا، وہاں بھی چار اور برف پوش پہاڑوں کی ہمسائیگی ہے اور دریائے نیلم شہر میں سے گزرتا ہے، ٹائرول کی طرح کشمیر کا ایک حصّہ اغیار کے قبضے میں ہے جسے واپس لینے کی لگن ہر دل میں ہے لیکن مماثلت یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ اقبال کا مصرع

افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

اِنسبُرک پہ صادق آتا ہے مگر 'فردوس بروئے زمیں ...... ؟' کشمیر کی حسین وادی صدیوں شعرا کے تخیّل کا مرکز رہی، آج اُس کے سیمابی آبشار اور نیلگوں آسمان کشمیریوں کی قسمت پر آنسو بہا رہے ہیں، ایک حصّہ محکوم و مجبور، ایک ترقی کی آس لگائے ہوئے! مقوما کو شکوہ تھا کہ آسٹریا چھوٹا ملک ہے لیکن ۱۹۶۴ء کی اولمپک کے لیے شہر سجایا جا رہا ہے، دو کروڑ شلنگ کی لاگت سے مصنوعی برف ڈلوائی جا رہی ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ مظفر آباد میں برقی روانی کم ہے کہ سورج غروب ہوتے ہی شہر نیم تاریکی میں ڈوب جاتا ہے، سرد ہوا چلنے لگی تو مجھے اپنے ہاں کی ایک راہگزر یاد آئی۔ سرِ شام برف پڑنے لگی تھی، ریزہ ریزہ برف نے پتوں کو ڈھانپ لیا تھا جیسے سفید ریشم کی جھالر ہو، دُودھیا سیل چار سُو تھا، ایستادہ کاروں، چھتوں اور منڈیروں کو ڈھانپنے کے بعد بیل گاڑی کے اکھڑے پہیّوں اور پرانے ٹائروں کے ڈھیر پر برف نے دیدہ زیب پوشش ڈال کر اُن کی درشتگی کا پردہ رکھ لیا تھا، جسیم پتھر سفید چادر میں منہ چھپا رہے تھے، منظر کی رعنائی کسی طور مغربی ملکوں سے کم نہ تھی لیکن ہر راہگیر مغرب کی اُترن پہنے نظر آیا، بعض مردِ سمور والے لیڈیز کوٹ پہنے ہوئے تھے، لوسیڈ کپڑے، ناموزوں جُوتے، کچھ مزدوروں کے ذمّے سڑک کو برف سے صاف رکھنا تھا، وہ بار بار ہاتھ مل کر اُنہیں گرم رکھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے، سخت سردی کی وجہ سے ہاتھوں میں خُون اُتر آیا تھا، ڈالڈا کے پرانے ڈبے میں چائے بنانے کی تیاری تھی۔

بند دکان کے کچے برآمدے میں ٹھٹھرے ہوئے بچے برفباری تھم جانے کے منتظر تھے، کھلے ہوئے گریباں، قلیل غذائیت کے آثار صورت سے نمایاں، ایک سوالیہ نشان اُن چہروں پہ مرتسم تھا، کیا یہ نرم و نازک پھول مرجھا جائیں گے؟ آنکھوں کے روشن کنول دھندلا جائیں گے؟ زندگی کی دوڑ میں یہ بھی پیچھے نہ رہ جائیں، باپ دادا خمیدہ کمر، اُفتاں و خیزاں چلے جا رہے ہیں، زندگی کا بوجھ اُٹھائے نہیں اُٹھتا، چہروں پہ جھریوں کے سائے، عزم متزلزل،

دلے دارم چو مرغ پا شکستہ
چو کشتی بر لب دریا نشستہ
(بابا طاہر ہمدانی)

انسانیت اپنا کھویا ہوا وقار پا لینے کی متمنی تھی، زمین و آسمان اُگلے ہوئے خزانوں کی بہتر تقسیم چاہتے تھے، شدید سردی میں جسم و رُوح کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے پہاڑوں کے باسی سوجتن کرتے ہیں۔ اہل خانہ اور ڈھور ڈنگر ایک کمرے میں رات بسر کرتے ہیں، اُسے گرم رکھنے کے لیے درخت کاٹیں تو تعزیرات کی زد میں آئیں، امن پسند شہری رہیں تو ٹھٹھر کے مر جائیں۔

بندگی میں میرا بھلا نہ ہوا

دریائے رائن بہہ رہا تھا، دریائے ٹیمز، سین، کولون اور ڈینوب صدیوں سے بہتے آئے ہیں، زمانے کے رُستاخیز اور ہنگامہ آرائیوں سے باخبر، انہوں نے عوام کی بے بسی دیکھی، پھر بادشاہوں کے سر کٹتے دیکھے، آج یہ دریا "سلطانیِ جمہور" کا جشن دیکھ رہے ہیں، ہوٹل کے بیرے کو آپ بڑے ادب کے ساتھ بلاتے ہیں۔ ڈیوٹی کے بعد ویٹرس بیش قیمت لباس پہن کے نکلتی ہے۔ ان ملکوں میں رنگساز، شاپ اسسٹنٹ یا ٹیکسی ڈرائیور ہونا باعثِ ننگ نہیں، یہاں ریل گاڑی، ریستوران اور اوپرا ہاؤس میں سب برابر ہیں اور ہماری مساوات

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

تک محدود ہے !

ابھی وسیوویس کی مہم باقی تھی، سرِ شام نیپلز کے لیئے ریپڈو یعنی تیز رفتار گاڑی مل گئی، عام گاڑیوں کی نسبت کرایہ کچھ زیادہ تھا، تھرڈ کلاس کے ڈبّے صاف ستھرے تھے اور گدیلوں سے آراستہ، سنٹرل ہیٹنگ کی سہولت میسر تھی، ہم سفر اطالوی تاجروں کے درمیان کسی بات پر بحث چھڑ گئی، جب پیشانی پہ پسینے کے قطرے نمودار ہونا شروع ہوئے تو ایک صاحب نے دروازہ کھول دیا اور CORRIDOR میں کھڑے ہو کر بحث جاری رکھی، سرد ہوا اندر آنی شروع ہوئی، مرّوت کے مارے مَیں خاموش رہا، لیکن جب دیکھا کہ بحث سے نجات ملے گی نہ سردی سے تو مؤدبانہ عرض کیا . . . . . .

نمبر دہرانا غیر ضروری ہے، مَیں نے انگریزی میں کہا، اُنھوں نے اشارے کنائے سے سمجھا، بہرحال دروازہ بند کر دیا، ماجد صاحب نے ایسی صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے نیا طریقہ وضع کیا تھا، بس میں بیٹھے ہوئے اطالوی کنڈیکٹر سے اُردو میں فرما رہے ہیں " میاں ! جان تو نہیں لینی، کرایہ لوگے نا ! ذرا دم لو، دیئے دیتا ہوں"۔ اُن کا کہنا تھا کہ کنڈیکٹر انگریزی سمجھتا ہے نہ اُردو تو کیا ضروری ہے کہ انگریزی میں گفتگو کی جائے۔ عزیز صاحب کی بات اور تھی، پیرس میں قومی اسمبلی کے دربان نے اُنہیں ٹوکا، عزیز نے فرانسیسی زبان سے لاعلمی کا اظہار کیا تو اُس نے جُملہ چُست کیا "مجھے تو اپنا مفہوم سمجھا نہیں سکتے اندر جا کر خاک پلّے پڑے گا !"

میرا ہم سفر ایک لحیم و شحیم امریکی نوجوان تھا جو مشرقِ وسطیٰ، ایران اور ترکی کا دورہ ختم کر کے 'پولیٹیکل اسلام' پہ تھیسس لکھ رہا تھا، جب میں نے موضوع کی وضاحت چاہی تو اُس نے کہا "کیا سیاسی طور پر اسلام مختلف اقوام کو ایک نکتے پر لانے میں کامیاب ہو گا یا

اس لحاظ سے عملی طور پر بے جان ہے!"

نیپلز میں جانا بُوجھا نظارہ آنکھوں کے سامنے تھا، ایسے سمندر کی لہریں ارضی توس کے ساتھ کھیلتی تھیں، بائیں جانب سوربینو کا شہر، سامنے اُفق پر کیپری کا جزیرہ، معزول بادشاہوں، کھلنڈرے شہزادوں اور آرٹسٹوں کی تفریح گاہ، نیس اور مونٹی کارلو میں بھی یہی کمان تھی۔ دونوں جگہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور ساحل کی مہین لکیر بیکراں سمندر کی تنگ آغوش میں تھی، نیپلز کے بازار میں گھومتے ہوئے ایک قہوہ خانے میں میں اطالوی بارمین سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں گفتگو کر رہا تھا۔ اُس نے بتلا دیا مزدوروں کی حالت اچھی نہیں، بندرگاہ میں جہاز لنگرانداز ہوتے ہیں تو اُنہیں کام ملتا ہے ورنہ بیکار رہتے ہیں۔ NO SHIPS NO WORK

اتنے میں بنیان پہنے ایک چوڑے چکلے سینے والا مزدور داخل ہوا اور باتوں میں شامل ہو گیا، کچھ دیر بعد مجھے مشتبہ نظر سے دیکھ کے کہنے لگا" تم اینگلو امریکن ایجنٹ تو نہیں"۔ میں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ سیاسیات یا جاسوسی سے میرا کوئی تعلق نہیں لیکن وہ بھرا بیٹھا تھا اور زبان کی دشواری حائل تھی، بارمین میرا ہمنوا تھا لیکن میں نے کھسک جانے میں مصلحت سمجھی۔

سمندر کی نیلی مخمل پر کیپری کا جزیرہ ایک دمکتا ہوا ہیرا ہے۔ پانی کو چیرتی ہوئی دیو قامت چٹانیں کیپری کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ہومر کی زندۂ جاوید رزمیہ" اوڈیسی" میں پری پیکر ساحرانہ موسیقی سے انجان ملاحوں کو پھانس لیتی ہیں، قیاس ہے کہ وہ جگہ کیپری تھی، جب ULYSSES کا جہاز وہاں سے گزرا تو اُس نے اپنے آپ کو سرِ مستول بندھوا لیا تھا!

جو سیاح کیپری جاتا ہے نیلم پری BLUE GROTTO کی زیارت ضرور کرتا ہے، تیز ہوا کی وجہ سے سمندر میں ہیجان تھا، ہماری ننھی کشتی ہچکولے کھاتی، زیر و زبر ہوتی

اُن پہاڑیوں تلے گزری جن کی چوٹیوں پر رُومی سرداروں نے بنائی تھیں
جواب بھی مغرور سنتریوں کی طرح پاؤں گاڑے کھڑی ہیں، جب ملاّح چابکدستی سے
کشتی غار کے تنگ دہانے میں دھکیلتے ہیں تو سب کشتی کے فرش سے چپک جاتے
ہیں، غار کے اندر خوابوں کی نیلگوں رانی اپنی سحر کاریوں کیساتھ جلوہ فرما ہے، خواب آلوُدہ
نیلاہٹ فضا میں معلّق ہے جیسے ایک رومانوی خواب منجمد ہو کے رہ گیا ہو، سورج کی
شعاعیں تہہ میں چمکتی ہوئی ریت اور سفید پتھروں سے منعکس ہو کر نیلے پانی سے یوُں
چھنتی ہیں کہ نیلگوں کے سوا سب رنگ جذب ہو جاتے ہیں۔

سفر کی آخری منزل قریب تھی، برقی ریل باغوں میں سے گزر رہی تھی، انگور کی
بیلیں مُرجھا گئی تھیں، خوشے سرور انگیز اطالوی شراب میں تحلیل ہو چکے تھے، البتہ
سنگترے بھرپور جوانی پر تھے، میلوں لمبی قطار میں پھل دار درخت، سُرخ اور سبز کا
امتزاج، حیات و ممات کا تضاد بھی تو موجود تھا، ہرے بھرے باغوں میں ٹنڈ منڈ درخت
سر نکالے کھڑے تھے، انگلستان اور فرانس کب سے خزاں کی لپیٹ میں تھے، خزاں ہمیشہ
تعاقب میں رہتی ہے۔

پومپیائی کی بہاروں کو بھی ایسی خزاں نے دفعتاً تاراج کر دیا تھا، پومپیائی اپنی
بہاروں پر نازاں تھا، انگوروں کے خوشے پک چکے تھے، مٹی کے بڑے مٹکوں میں
شرابِ رسیدہ محفوظ تھی، حُسن و جوانی عیشِ نعیم کے گہوارے میں جھُول رہے تھے، دفعتاً
ویسو ویس کی پُرسکون چوٹی لاوا، سنگریزے اور راکھ اُگلنے لگی، یہ یلغار تین روز تک جاری
رہی، اس حسین شہر کا گرم راکھ تلے دب جانا ایک عظیم المیہ تھا لیکن راکھ کی موٹی تہہ
کے طفیل رومیوں کی روزمرّہ زندگی کا عکس صدیوں کے لیے محفوظ ہو گیا۔

'فورم' پومپیائی کی زندگی کا محور تھا، یہیں شہر کی عدالتیں تھیں، بچے کھچے مرمریں
ستون فنونِ لطیفہ میں یونانی وراثت کے شاہد ہیں، تراشیدہ پتھروں سے بنی ہوئی

کشادہ سڑک پر رتھ چلانے کے نشان اب تک موجود ہیں۔ معبد، ایمفی تھیٹر، کوچے اور مکان مکینوں کی نفاستِ طبع کا پتہ دیتے ہیں، اس 'نفاست' میں بربریت کا عنصر بھی تھا۔ ایمفی تھیٹر میں تندرست و توانا غلاموں پر بھوکے شیر چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ تماش بین اُن کی لڑائی سے محظوظ ہوتے، کبھی دو غلاموں کو لڑائی کا حکم دیا جاتا۔ فاتح ایک پاؤں مفتوح کے سینے پر رکھ کر اُوپر دیکھتا، اعلیٰ طبقے کی خواتین انگوٹھے کے اشارے سے مغلوب کی قسمت کا فیصلہ کرتیں، زندگی اور موت کے درمیان کش مکش دیکھنے والوں کے لیے سامانِ تفریح تھی۔

چند مکانوں میں استعمال کی چیزیں اب تک قرینے سے دھری ہیں جیسے مکیں ابھی ابھی گئے ہوں، ہوا بھی یہی تھا، سارا شہر آناً فاناً آتشیں لاوے کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ یوں تو عجائب خانے کی کئی چیزیں قابلِ ذکر ہیں، منقّش کوزے، کھانا پکانے کا سامان، جراحی کے اوزار، تراشیدہ اصنام، لیکن جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اُس بدنصیب کا 'خاکہ' تھا جسے لاوانے گھیر لیا تھا، وہ اکڑوں بیٹھا ہے اور چہرے کو بازوؤں کے ہالے میں لیے ہے جیسے کہہ رہا ہو" میرے اللہ! یہ کیا آفت آئی!" ایک انسان کا آخری کرب سانچے میں ڈھل گیا، آتش فشاں کی راکھ نے ایک ہیولیٰ بخش کے اُس کو زندۂ جاوید کردیا، رہے نام اللہ کا۔

قصرِ الحمرا میں جابجا لا غالب الا اللہ لکھ رکھا ہے، لاریب اللہ ہی ہے جو بالآخر غالب رہتا ہے۔ کسے مجال کہ اُس کی ہمسری کا دعویٰ کرے، الحمرا ایک خوب صورت نگینے کی طرح پہاڑوں کے درمیان جڑا ہے۔ فن پر دو رعب خشیتہ اللہ کی تصویر تھے، انہیں ڈر تھا کہیں ایسا نہ ہو جلال و جمال کے اِس مرقع میں بیٹھ کر ہم میں نخوت آجائے اور ہم یہ بھول جائیں کہ سروری فقط اُس مالکِ حقیقی کو زیب دیتی ہے۔ آج بھی قصرِ الحمرا کے گوشے گوشے میں صدیوں پرانی صدا گونجتی ہے لا غالب الا اللہ

پومپیائی کے باسیوں نے اس حقیقت کا اعتراف نہ کیا، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، پومپیائی کے کھنڈر بہانگِ دُہل اعلان کر رہے ہیں :۔ لا غالب الاّ اللہ

بحیرۂ روم کا نیلگوں پانی ـــ جملۂ مرگ و خزاں سے بے نیاز"۔ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا" صدیاں ہوئیں مَیں ایسا ہی تھا جب میرے سینے پر باہمّت عربوں نے سفینے ڈالے تھے اور صیقلیہ میں اسلام کا نشان گاڑ دیا تھا" لیکن زندگی تو آگے بڑھتی رہتی ہے اور برقی ریل بھی سُرعت کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی، پہاڑیاں، ڈھلوانیں اور میدان، گھاس اور کھیتوں سے ڈھکے ہوئے میدان، خوب صُورت شہروں کو ہالے میں لیے ہوئے میدان اور تین اطراف سے سمندر کو گھیرے ہوئے پہاڑ گزرتے رہے۔ کوہ ویسو ویس کی چوٹی ـــ باری تعالیٰ کی قہاری و جبروت کی مظہرِ اتم ـــ ان مناظر کو گھور رہی تھی، خطۂ روم کے گل و گلزار حیاتِ مُدام کا فریب دے رہے تھے، ؏ دُنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم ، باغِ خُلد سے نکالے گئے، جنّتِ ارضی میں جگہ پائی، زندگی کے دُکھ بلائے جان سہی لیکن وہ جینا کس کا تھا جو جذبات سے عاری تھا، جس میں قعر تھا نہ تنوّع

پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میّسر تو کیا
اُس کو میّسر نہیں سوز و گدازِ سجود (اقبالؔ)

حضورِ خداوندی وصلِ دوام کے مترادف تھا تو ہجر میں بھی اِک گُونہ لذّت ہے ۔

مجھے سرینتو کی وہ رات ہمیشہ یاد رہے گی ـــ اندھیری رات میں غصیلے سمندر کی لہریں کنارے سے ٹکرا کر اپنا زور کھو رہی تھیں۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا جیسے کسی ملاّح کی موت کا راگ الاپ رہی ہو، نیپلز کا شہر حدِ نظر پر قوس کی شکل میں بکھر گیا تھا، اُس کی ٹمٹماتی روشنیوں پر پرستان کا دھوکا ہوتا تھا، سرینتو اعظیم المرتبت شاعروں نے تیری رعنائی کے گیت گائے جیسے اطالوی دوشیزاؤں نے تانوں میں ڈھالا۔

آج ایک غریب الوطن کا خراج قبول کر ۔

یورپ کے سمن زار الوداع! جب تک یہاں رہا ذہن لاشعور میں کھٹکا کیا کہ میری حیثیت مہمان کی سی ہے، تمہارا فریب خوش گوار تھا اور بلائے جان بھی، ہم آخر دم تک زندگی کا فریب یونہی کھاتے ہیں۔ دیدہ دانستہ

رام نگردد جہاں تا نہ فسونش خوریم
جز بکمندِ نیاز ناز نگردد اسیر
(اقبالؔ)

میں گیروانہ کپڑے پہنے "تماشائے اہلِ کرم" دیکھتا رہا، یہ جانتے ہوئے کہ میرے زخموں کے لیے یہاں کوئی مرہم نہیں میں اُس ہجوم میں شامل ہو گیا تھا جو کوچہ بکوچہ درد کا درماں ڈھونڈتا ہے۔ زندگی کے دن یوں گزرتے رہے جیسے ایک سراب ہو۔ حقیقت سے کہیں دُور، جس کا طلسم کچھ دیر تک ٹوٹ جائے گا۔ بیداری کا شعور خواب کے تعاقب میں رہا۔ یہ بھی نہیں کہ وہ احساس ہمیشہ خوش گوار ہی تھا۔ اس میں ڈراؤنے خواب کی تلخی بھی شامل تھی اور متعدد بار اس خیال نے ستایا کہ یہ خواب ختم کیوں نہیں ہو چکتا۔

۶۵-۱۹۶۳ء

قوسِ قزح سے فرار

گیارہ بجے قبل از دوپہر انٹرویو

مسٹر ہینگن فیلٹ سیکرٹری دیہی ادارہ جات

کوئی پچاس کا سن ہوگا، دراز قامت، کشادہ سینہ، کھلتا ہوا چہرہ، ہینگن وجیہہ اور باوقار شخص تھا، میرا انٹرویو سرکاری سلسلے میں تھا لیکن ابھی بارہ نہیں بجے تھے کہ اُس نے کہا "قریب ہی ایک ریستوران ہے جہاں میں دوپہر کا کھانا کھاتا ہوں، آپ بھی شمولیت کریں تو مجھے خوشی ہوگی"۔ گنڈولن ریستوراں میں ایسے لوگ آجا رہے تھے جن کی حیثیت مستقل گاہکوں کی تھی، انتظامیہ کے لیے وہ جانی پہچانی شخصیتیں تھیں، میں نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ سویڈن میں قسم قسم کی سلاد اور مچھلی میز پر آتی ہے اس لیے بھوک رکھ کے کھانا چاہیئے، لیکن کھانے میں اتنا تنوع تھا کہ مجھے دھوکا ہوا، سفید سلاد ساس کے ساتھ، روسی سلاد اور شرمپ، چھوٹی نسل مچھلی کھٹائی میں ڈوبی ہوئی، پھر ثابت ٹراؤٹ، میرا میزبان مُصر تھا کہ مجھے ہر کورس چکھنا چاہیئے، میں بچنت تھا کہ کوئی میٹھی چیز آتی ہوگی، کیا دیکھتا ہوں کہ بہرا ایک بڑی قاب میں فرائی انڈے اور گردے کے کٹلٹ لیے آرہا ہے، میں نے معذرت چاہی تو ہینگن نے خالص مشرقی تکلف برتا، پھر آئس کریم اور کوفی۔

ہم بالکونی میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، چوک میں باغیچہ اور پھولوں کے تختے دیکھ کر مجھے خیال آیا سٹاک ہوم بھی خوب شہر ہے، سبزہ جہاں جہاں بہیں لالہ چمن چمن نگر، اردگرد خوبصورت نہر اور مالز جھیل، قدم قدم پر چمن، کنُدس گاتن کے چوک میں صبح و مسا عوام کے لیے محفلِ سرود جمتی ہے، میرا میزبان کہہ رہا تھا "مجھے افسوس ہے مَیں آج شام دو ہفتے کی چھٹی پر جا رہا ہوں ورنہ گھمانے کے لیے تمہیں باہر لے جاتا، تم فالن جا رہے ہو؟ فالن کا نواحی علاقہ بڑا دلآویز ہے، ہم نے گرمیاں گزارنے کے لیے وہاں ایک مکان خرید لیا ہے، تم تنہائی محسوس کرو تو بلا تکلّف مجھے فون کر دینا، میں آ کر لے جاؤں گا، مجھے اور میری بیوی کو خوشی ہو گی اگر تم چند دن ہمارے ہاں گزار سکو" مَیں نے سوچا یورپ کے کسی حصّے میں مجھ ایسے اجنبی کے ساتھ شاید ہی کوئی اس قدر مروّت سے پیش آئے۔

"اگر بُرا نہ مانیں تو ایک سوال پوچھوں!" مَیں نے لینگن فیلٹ سے کہا "مَیں نے ایک رسالے میں پڑھا تھا کہ سویڈن اور ناروے میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد یورپ میں سب سے زیادہ ہے۔ مصنّف نے ایک وجہ یہ لکھی تھی کہ زندگی سہل ہو گئی ہے، بیماری بیروزگاری یا بڑھاپے کا خوف نہیں رہا۔ بچّوں کی تعلیم اور نگہداشت بھی حکومت کی ذمہ داری ہے، زندگی میں کوئی چیلنج باقی نہیں"۔

"یہ بات نہیں"، لینگن نے کہا "شاید ہم لوگ فطرت سے زیادہ قریب ہیں، شمالی منطقہ کے لوگوں کو لیجئے، وہاں دسمبر سے فروری تک سورج نظر نہیں آتا، بہت سے لوگ محنت مزدوری کرنے جنوب میں آ نکلتے ہیں لیکن آغازِ گرما میں وہ واپس جانے کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اُن کے 'ملک' میں مئی سے جولائی تک سورج نہیں چھپتا۔ آدھی رات کو بھی برابر چمکتا ہے، تب بھی وہ یہاں نہیں ٹکتے، یہ نیم شب کا آفتاب اُن کی خاص چیز ہے"۔ لینگن فیلٹ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، مہینوں ظلمت کی سیاہ چادر ہر چیز کو ڈھانپے رکھتی ہے، پھر جیسے صبحِ ازل کی نمود ہو، پہاڑ، ندیاں اور دودھیا آبشاریں زندگی کا نور

چہروں پہ پیلے خواب اجل سے بیدار ہوتی ہیں، دن رات سورج کی شعاعیں برف پوش پہاڑوں پر جھلمل جھلمل کرتی ہیں۔" اسی طرح باقی سوئیڈ بھی اپنے خطّۂ زمین سے بے حد مانوس ہیں، جب انہیں روزی کمانے کے لیے شہر آنا پڑتا ہے تو ماحول سے دُوری اور عزیزوں سے بچھڑنے کا غم برداشت نہیں کر سکتے۔"

دوسرے روز رینبلاٹ سے ملاقات ہوئی جو مقامی کونسل کا سوشل ویلفیئر افسر تھا، خوش اخلاق، خوش مزاج، پہلی ملاقات میں ہی اصرار کرنے لگا کہ میں اُس کا مکان ضرور دیکھوں "تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک اوسط درجے کا سوئیڈ کیسے رہتا ہے۔ میری تنخواہ دو ہزار سوئیڈش کراؤن ہے پچیس فیصد انکم ٹیکس میں چلا جاتا ہے، یہاں جوتوں کے کارخانے میں کام کرنے والے مزدور کو بھی بیس فیصد انکم ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ مکان کا کرایہ ۳۲۰ سوئیڈش کراؤن دیتا ہوں۔ میری بیوی بچّوں سمیت موسمِ گرما گذارنے کے لیے جھیل سی لیان گئی ہوئی ہے۔ وہاں ہمارا چھوٹا سا سمر ہاؤس ہے، اسی لیے میرے پاس اپنی کار نہیں۔ تم دیکھوگے فیکٹری میں کام کرنے والے بیشتر مزدوروں کے پاس کاریں ہیں لیکن جھیل کے کنارے ان کا اپنا مکان نہ ہوگا۔ ہم دونوں چیزیں بیک وقت نہیں خرید سکتے۔ تم میری بیوی کو مل کے خوش ہوگے، وہ ٹپیکل سوئیڈش بلانڈ ہے"۔ رینبلاٹ نے کہا اور شام کو اس کے دوست کی فاکس ویگن سی لیان جھیل کا راستہ طے کر رہی تھی، خودرَو جنگلی پھول، نازک ٹہنیوں والے صنوبر اور دراز قامت شمشاد کی لمبی قطاریں، "یہاں سے ذرا منظر دیکھنا" رینبلاٹ نے ایک اُونچی جگہ گاڑی روک لی، گندم کا سرسبز کھیت ڈھلوان تک جاتا تھا، جھیل اور ڈھلوان کے درمیان درختوں کا گنجان ذخیرہ حائل ہو گیا تھا۔ ڈھلتے سورج کی شعاعوں سے سطحِ جھیل پہ سیّال سونے کی تہہ جمی تھی، جھیل کے اردگرد سُرخ چھت والی لکڑی کی کاٹیج بکھری تھیں، مسز رینبلاٹ ایک بے حد صحت مند خاتون تھی، بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئی اور اپنے بچّوں کو متعارف کرانے لگی، تعارف کے وقت سوئیڈش بچے مشرقی انداز میں جھکتے ہیں، بچّے مجھے اپنی کشتی دکھانے لے گئے، گھنے درختوں کے بیچوں بیچ

خود رَو جھاڑیوں سے بچتے ہوئے ہم جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ کشتی پانی میں ڈول رہی تھی، معاً مجھے فلم ری بیکا کے بوٹ سین کا خیال آیا، وہاں بھی ایک کشتی پُراسرار جھیل کے کنارے ڈولتی ہے۔ رات کے دس بجے تھے لیکن چٹپٹا ساتھ دے رہا تھا، روشن آسمان پانی میں منعکس تھا، کنارے سے ٹکراتے ہوئے پانی کی لپ لپ خاموشی کو توڑ رہی تھی۔

تماش بینوں سے بھری ہوئی دُخانی کشتی سٹاک ہوم کا چکر لگانے کے لیے نہر میں خراماں خراماں چل رہی تھی۔ کنارے پہ ایک صاحب مچھلی پکڑنے کے لیے نظریں نیچی کیے سنجیدگی سے یوں کھڑے تھے جیسے نماز کے لیے نیت باندھی ہو۔ "میں کیمرے کے متعلق مَیڈ ہو رہی ہوں، جی چاہتا ہے سب چیزیں پانی میں پھینک دوں"۔ پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی نے کہا "مجھے افسوس ہے ڈارلنگ یہ کوفت تمہیں میری وجہ سے ہوئی"۔ بوڑھے امریکن نے لجاجت سے کہا "تمہارا اس میں کیا قصور تھا، میرا جی کُڑھ رہا ہے کہ کیمرہ کیوں بھُول آئی"۔ "اس ملک میں چوبیس ہزار جزیرے ہیں"، گائیڈ کہہ رہا تھا، "آپ کی دائیں جانب دنیا کا سب سے پہلا آٹومیٹک لائٹ ہاؤس ہے، قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ جس شخص نے ساحل سمندر پر روشنی کا مینار لگایا خود بینائی سے محروم تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سُرخ چھت والی عمارت انگرڈ برگمین کا مکان ہے، ہم زیادہ فلمیں برآمد نہیں کرتے، اس کی بجائے گریٹا گاربو اور انگرڈ برگمین جیسی فلم ایکٹریس درآمد بھیجتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بائیں جانب کاؤنٹ برناڈٹ کی جاگیر ہے، وہ فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان صُلح کروانے گیا تھا اور وہیں قتل ہوا، گھنے درختوں میں چھپا ہوا سفید محل ایک موٹر مرچنٹ پرنس کا ہے، دائیں طرف جو جزیرہ ہے یہاں چار سو سال پہلے بادشاہ بھیڑیے کا شکار کرتا تھا"۔

"جانی اُس نے سویڈنش میں کیا کہا ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"وہ انگریزی میں ابھی بتلائے گا، ذرا صبر کرو"، لڑکی نے قدرے درشتی سے کہا، جی میں آئی کہ عارضی محبوبہ کو کہوں گھنٹہ دو گھنٹے اپنے جذبات قابو میں رکھو اور بوڑھے کی

محبت کا دم بھرتی رہو، کشتی رُکی تو میں نے محبوبہ پہلی بار دیکھی، خاصی پلین جین تھی، موٹے شیشوں والی عینک، گول گول چہرہ، پھُولے ہوئے گال۔ سامنے جزیرہ لی ڈینگو پہ سویڈن کے قومی سنگ تراش کارل می لس کا گھر تھا، مرنے سے پہلے وہ یہ خوبصورت محل اور آرٹ کا لافانی خزانہ قوم کے نام چھوڑ گئے تھے، ارد گرد باغات، تہہ در تہہ قطعات میں فوارے پھُول اور جھُومتے ہوئے درخت، قدموں میں جھیل مالر کا بسیط پانی، مناسب وقفوں پر سنگ تراشی کے نادر شاہکار جس خوبصورتی اور تناسب کے ساتھ انسان، حیوان اور ملائکہ کو دھات اور پتھر میں ڈھالا گیا ہے دیکھ کے عقل دنگ تھی اور بائرن کے متعلق اقبال کا شعر یاد آتا تھا

خیالِ او چہ پری خانۂ بنا کردہ است۔
شبابِ غش کند از جلوۂ لب بامش

ٹن ٹنا ٹن ٹن

لیول کراسنگ کی گھنٹی بج رہی ہے، خبردار رہو گاڑی گزر رہی ہے۔ کاسنی پھولوں در لکڑی کے گھروندوں سے دامن کشاں، عریض جھیلوں سے کنارہ کش، لاتعداد ننھے جزیرے اور سرسبز ٹاپو پیچھے چھوڑتی ہوئی، ایک شاہراہ گزر چکی، پھر دوسری اور تیسری، ہر لیول کراسنگ پہ خودکار گھنٹی مسلسل بج رہی ہے، ٹن ٹنا ٹن ٹن، سویڈن کے خوش حال باسیو! کاریں روک لو، سائیکل سوار پھُرتیلے لڑکے! لیول کراسنگ دم لے لو، تیز رفتار گاڑی گزر رہی ہے، پتھر کے پرانے پل! جاڑوں میں برف کی تہیں تم پہ جم جاتی ہوں گی مگر اب تیرے نیچے شفاف پانی تیزی سے بہہ رہا ہے، میرے دوست! تم اسٹیشن کے قُلی ہو؟ مشرق میں قُلی کی کمر بھاری ٹرنک کے نیچے تہہ ہو جاتی ہے، تم موٹر ٹرالی میں سامان رکھے مزے سے ڈرائیو کر رہے ہو، سینۂ دریا پہ بہتے ہوئے تختو! تمہیں کیا جلدی ہے؟ کاغذ کی فیکٹری تو ابھی دُور ہے۔ سالخوردہ مکانو! تمہارے مکین کہاں ہیں؟ تانبے کی کان ختم ہوتے ہی سارا میلہ بکھر گیا؟ اے سرزمین! تیرے وائی کنگز کو کیا سُوجھی تھی کہ وہ مہم جوئی میں انگلستان اور فرانس کے ساحلوں پہ سرگرداں رہے۔ یہ ملک کتنا

حسین ہے اور قدرتی دولت سے مالا مال!

برقی ٹرین خیابان اور جھیلیں سُرعت کے ساتھ طے کرتی ہوئی مجھے اجنبی منزل کی طرف لے جا رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں طویل جھٹپٹے کا طلسم چھا جائے گا، درختوں کے جھنڈ سے روایتی کریہہ المنظر بونے نکل آئیں گے جو بچوں کو خواب میں ڈراتے ہیں ....

اے لمحۂ گریزاں ساکت ہو جا، مجھے اس مرقع کو اپنی ذات میں سمونے دے، ازلی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے دے۔ اے دلفریب منظر تو طلسم سہی لیکن سحر پھونکنے سے طلسم کو بھی پائندگی نصیب ہو سکتی ہے، ٹن ٹنا ٹن ٹن لیکن گاڑی گزر رہی ہے اور اُس کے ساتھ وقت کی رفتار بھی، بقول گالز ورردی

"جس انسان کے اندر احساسِ حُسن موجود ہے اُسے زندگی میں جنّت نہیں مل سکتی، دائمی مسرت اس کے قبضے سے باہر ہے، چند لمحے البتہ ایسے ضرور آتے ہیں جب ایک سریع بیخودی آپ ہی آپ روح پہ طاری ہو جاتی ہے لیکن یہ لمحے گریز پا ہیں جیسے بادل کا وہ ٹکڑا جو وقتی طور پر سورج کے سامنے آ جائے۔"

(ترجمہ از پطرس)

صبح فالن میں خاصی بارش تھی، معلوم ہوتا تھا جھڑی سارا دن رہے گی، ہم چند میل دُور ایک کمیون میں "معمر لوگوں کا گھر" دیکھنے جا رہے تھے، راستہ جھیلوں سے پٹا پڑا تھا، ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی جھیل ہوتی ——— مسز گرینڈن کہنے لگی "ڈلارنا کا یہ علاقہ اس ملک کا سوئٹزرلینڈ ہے" مسلسل پھوار بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ کبھی آسمان نکھر جاتا، سورج اور بادل دیر تک آنکھ مچولی کھیلتے۔ یہ منظر انگلستان کے لیک ڈسٹرکٹ کی یاد دلا رہا تھا لیکن وہاں ایسے طویل قامت اور گنجان درخت کہاں تھے، لیک ڈسٹرکٹ کی رعنائی نسوانی تھی، ایک جھیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسز گرینڈن نے کہا "یہ مُردہ جھیل ہے، اسے کاغذ کی فیکٹری نے برباد کر دیا ہے، اب اس میں ایک بھی جاندار چیز باقی نہیں۔"

ایک پُرفضا جگہ پر گاڑی رُکی جیسے پاکستان میں کوئی پہاڑی مقام ہو، گھاس کے انباروں کی بھینی مہک ہوا میں پھیل گئی تھی، سامنے گرجا چمک رہا تھا، رواج کے مطابق کمیون سے جمع شدہ ٹیکس کا دسواں حصّہ گرجے کی نذر کر دیا جاتا ہے، عمر رسیدہ لوگوں کے گھر کی تعمیر مرکزی حکومت نے کی تھی لیکن روزمرّہ کا خرچ کمیون کے ذمے تھا، گھر کیا تھا اچھا خاصا ہوٹل تھا، تین نشست گاہیں، لائبریری، گلدانوں میں تازہ پھول، رہائشی کمروں میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، سادہ مگر آرام دہ فرنیچر، منتظمہ کہہ رہی تھی" ایسی ادویات تو میسّر ہیں جن کی مدد سے بڑھاپے میں جسمانی کمزوری پر قابو پا لیا جائے لیکن بعض اوقات معمر لوگ ذہنی اُلجھنوں میں مبتلا ہوتے ہیں، اُن کی دیکھ بھال کے لیے اصلاحی اداروں کی تعداد ناکافی ہے، یہ کیس ایسے خراب بھی نہیں ہوتے کہ انہیں دماغی امراض کے ہسپتال میں بھجوا دیا جائے۔

پہلے کمرے میں داخل ہوئے تو ایک اندھا اپنا ٹیپ ریکارڈر سیٹ کر رہا تھا، اُسے اس بات پہ فخر تھا کہ بینائی سے محروم ہونے کے باوجود وہ ٹیپ ریکارڈر استعمال کر سکتا ہے

"یہ ہمارے دوست پاکستان سے آئے ہیں، ان کا پیغام آپ کو ریکارڈ کرنا چاہیے"

مَیں نے چند الفاظ کہے۔

"ہاں تو انہیں گانا بھی سنا دیجئے نا"

ان صاحب کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہوگی، صحت اچھی تھی۔ بیچارا کان کن تھا اور چند برس پیشتر کان پھٹ جانے کی وجہ سے اندھا ہو گیا تھا، وہ شادی شدہ نہ تھا، اُس نے اکارڈین تھام کے "لطخوں کا گیت" گانا شروع کیا، فرطِ جذبات سے اُس کے موٹے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

ہمارے اِس برفانی اور کہُر آلود ملک میں
سورج کی جھلک نظر آتے ہی ہمارے چہروں پہ مسکراہٹ کھل جاتی ہے
جب سورج آسمان میں بلند ہوتا ہے

اور اس کی تمازت سے یخ بستہ جھیلیں پگھلتی ہیں
تب جنگلی بطخوں کی ڈاریں ہمارے پاس سے گزرتی ہیں
تب ہم جان لیتے ہیں کہ موسمِ گرما دُور نہیں
برف ایسی سفید بطخوں کے پرے جنگل کے اُوپر تیرتے ہیں
یہ جنوب سے گرما کی نوید ہے
قریہ کے اُوپر بہت اُوپر "ریوڑ ریوڑ" کی صدا فضا میں گونجتی ہے
ہمارے دل یہ صدا سننے کے لیے بے تاب رہتے ہیں
جب بہار میں جنگلی بطخوں کی ڈاریں گزرتی ہیں
تو ہم جان جاتے ہیں کہ موسمِ گرما دُور نہیں

مشرق میں اب تک خاندان کا بزرگ گھر کی زندگی کا محور ہے، بالعموم اُس کا حکم چلتا ہے، بہو بیٹیاں۔ پوتے پوتیاں اُسے گھیرے رہتی ہیں، اہلِ مغرب اس فرسودہ نظام کو کب کے خیر باد کہہ چکے، وہ برملا کہتے ہیں کہ خاندان صرف میاں بیوی اور چھوٹے بچّوں پہ مشتمل ہے۔ باقی اس دائرے سے خارج ہیں۔ تنقاوتِ قلبی کے ایسے قصّے سننے میں آئے جب بیاہے ہوئے بیٹوں نے "دارالمعمرین" کے منتظمین کو فون کر دیا "تہوار کے موقع پر ہمارے ابّا کو گھر مت بھجوائیے۔ مبادا ہماری کرسمس پارٹی کرکری ہو جائے!"

"بغل میں بجلی کے مستری کا گھر ایک نظر دیکھ لیں"۔ مسز گرینڈن نے کہا، نشست گاہ اور کھانے کا کمرہ۔۔ ریڈیو اور ریفریجریٹر، چمکتا ہوا لکڑی کا فرش، بجلی کے چولہے پر گوشت بھونا جا رہا تھا!

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند (اقبال)

فنی مہارت میں وسطی پنجاب کے مستری کسی سے کم نہیں، ایکسیڈنٹ میں تباہ شدہ کار

دنوں میں اصلی حالت پہ لے آتے ہیں، انجن کھول کے جوڑ دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لیکن انگریزی میں شُدھ بُدھ نہ ہونے کی وجہ سے ترقی نہیں کر پاتے، عام فہم زبان میں درسی کتب مہیا نہیں، نہ ہی ورکشاپ میں باقاعدہ تربیت کا انتظام ہے۔ کام سیکھنے کے لیے کم سن شاگرد اوزار لے کر گاڑی کے نیچے لیٹ جاتے ہیں، میلے کچیلے ہاتھ، قمیص اور پاجامے پہ تیل کے بڑے بڑے دھبے، مستری ہونا تو بڑی بات ہے یورپ میں ہر پٹرول پمپ کا معاون سفید اوور آل پہنے ہوتا ہے، کام کے دوران ہر کاریگر کو قانوناً چرمی یا سُوتی دستانے پہننا پڑتے ہیں۔

آخری روز ائر فرانس کے دفتر میں نائب منتظم سے ملاقات ہوئی، وہ سوربون یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا، باتوں باتوں میں اُس نے کہا "موسیو خروشیف یہاں آرہے ہیں لیکن اُن کی حفاظت کے لیے آٹھ ہزار پولیس کانسٹیبل درکار ہیں، وہ کہاں سے آئیں؟ سارے ملک میں اتنی پولیس نہیں ...." میں نے فرانسیسی اور سوئیڈ کیریکٹر میں تضاد کا ذکر کیا تو اُس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے "فرانسیسی زیادہ ذہین ہیں، بذلہ سنج ہیں، فرانسیسی مزدور بھی ہر بات کو پرکھتا ہے، ہر اہم مسئلے پر اپنی رائے رکھتا ہے، ہماری طرح نہیں کہ جو بادشاہ یا وزیر اعظم نے کہا ساری قوم نے اُس پر لبیک کہہ دیا، فرانسیسی طالب علم مذہب کو بھی زیر بحث لے آتے ہیں، فرانس دنیا میں ایک ایسا ملک ہے جہاں کسی کو مفلسی کی وجہ سے شرمسار ہونے کی ضرورت نہیں، ہم لوگوں میں نظم و نسق کا مادہ ہے، ہم سر بازار جذبات کا مظاہرہ نہیں کرتے لیکن کچھ دیر ٹھہرو تو تم جان جاؤ گے کہ ہمارے ظاہری سکون کے پیچھے ایک بے اطمینانی ہے، ایک روحانی خلش جو اپنا مداوا نہیں پاتی، جب موقع ملتا ہے ہم فطرت سے ہم کنار ہونے کے لیے شہر سے بھاگتے ہیں۔"

سوئیڈ بھائیو! تمہارا ملک جاذب ہے، یہاں آدھی رات کا سورج جادو جگاتا ہے، نیم شب میں رنگِ سحر گھولتا ہے، یہاں گرما میں تاریکی نہیں چھاتی، آتشا کا اُجالا رہتا ہے، میں بھی آدم نژاد ہوں، دھرتی کے رُوح پرور نظاروں کی دید میں تمہارے ساتھ برابر شریک ہوں، میرا خمیر

اُسی خاک سے اُٹھا ہے جس سے تم پروان چڑھے ہو، اخوّت کا یہ رشتہ کیا کم ہے!

ساری پونجی سوئڈش کرنسی خریدنے میں صرف ہوگئی تھی چنانچہ لنچ کے وقت ایک سینڈورچ اور کوفی کی پیالی پہ اکتفا کیا، "ایئرپورٹ کا ٹیکس پانچ سوئڈش کراؤن ادا کر دیجئے" لڑکی مسکرا رہی تھی، میں نے گھبرا کے جیبیں ٹٹولیں، پچیس امریکن سینٹ، چند شلنگ اور فرانک، جان میں جان آئی، ساتھ ہی لڑکی نے کارڈ دیا، "ہوائی کمپنی کی طرف سے آداب، مطار پر جو چاہیں نوش فرمائیں، سکاچ وہسکی، نارویجین بیئر، برانڈی ......" اپنا بھوک کے مارے بُرا حال تھا۔

یہ سکینڈے نیویین ائیر لائنز کی ڈی لکس فلائٹ تھی، سارے جہاز کو فرسٹ کلاس میں تبدیل کر دیا گیا تھا، چاروں پنکھوں کو گردش ہوئی، یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے افسردہ سیٹی بج رہی ہو۔ پنکھوں کی گردش تیز تر ہوئی، زخم خوردہ درندے کی طرح جہاز اندھا دُھند سیدھا بھاگا اور ایک جست لگا کے فضا میں بلند ہوگیا، رات کے دس بج رہے تھے، ائرپورٹ کی رنگا رنگ بتیاں ایک ایسے آسمان تلے ٹمٹا رہی تھیں جو تاریک تھا نہ روشن، جھٹپٹے کا عالم، تکونے کھیت، خوشنما اور بے ہنگم کھیت، درختوں کے ذخیرے اور بل کھاتی ہوئی سڑک، پانی میں تیرتے ہوئے بجرے جیسے کاغذی ناؤ .... جہاز اُڑتے ہی اعلان ہوا کہ اب سیر ہوگا، شراب نوشی بے حد سنجیدگی کے ساتھ شروع ہوئی۔ رنگارنگ جام اور متنوّع شراب، مسافروں میں بلا نوشوں کی کثرت تھی، انکار کی نوبت نہ آتی تھی، ساقی بھی پلانے پر مُصر تھا، گاہے کاگ کھول کے بوتل ناک کے قریب لے جاتا تو مے نوش مہک سے محظوظ ہوتا اور اثبات میں سر ہلا دیتا، یہ چھٹا دَور تھا، اسکاچ، مارٹینی، شیری، سفید شراب، شمپین ......مسافر ساقی کی دریادلی کے آگے عاجز تھے، آہستہ آہستہ پینے والے میدان چھوڑنے لگے، میرے معمّر ہمسائے نے بیوی کی خفگی کے باوجود طعام کے بعد کونیک لیا، سر کے تمام بال سفید تھے، ہچکی مسلسل آ رہی تھی، "ایک مخانہ مے" ــــ دیارِ مغرب کی ایک جھلک تھی، ڈاکٹر جانسن نے کہا تھا، "زندگی

کا جام بہر نوع پُر کرنا ہے، جو شخص لطیف حیات سے بہرہ مند نہیں وہ لا محالہ بوالہوسی کی طرف رجوع کرے گا۔"

پیرس کے میکسم ریستوراں کا کھانا تھا، جیلی میں لپٹا ہوا یخ بستہ جگر، گرم چکن پیٹی، بحیرہ روم اور جزائر غرب الہند کے پھل، کونی کے ساتھ چھوٹی پیسٹری اور چاکلیٹ، سپر رات کے بارہ بجے ختم ہوا۔

ہم ناروے کے اُوپر پرواز کر رہے تھے، "چودھویں رات کا ماہتاب جواں" پانی میں تیر رہا تھا، شفق سنولائی تو تاریکی کا مرحلہ طے کیے بغیر صبحِ صادق اُس کی جانشین ہوئی، دھندکے کا طلسم نہیں ٹوٹا، بادلوں کے ٹکڑے دُھنی ہوئی روئی کی طرح فضا میں اُڑ رہے تھے، اب آئیس لینڈ دُور نہ تھا . . . .

آنکھ کھُلی تو جہاز کریبین کے نیلگوں پانی پر پرواز کر رہا تھا جو گذشتہ چند صدیوں میں متعدد بار انسانی بربریت سے سُرخ ہوا ہے، سرمئی بادلوں کے جھنڈ گھرے اور خوفناک تھے جیسے کوہِ آتش فشاں سے دھوئیں کے مرغولے بلند ہو رہے ہوں، سمندر اور بادلوں کے درمیان ایک عظیم قوس بن گئی تھی، ایک عظیم نصف دائرہ، خدائے لم یزل کی جمالی صفات کا مظہر، قوسِ قزح میرا تعاقب کر رہی تھی، اُس امریکی گانے کے علی الرغم

I HAVE BEEN CHASING RAINBOWS

پورٹوریکو کا جزیرہ سو میل لمبا اور پینتیس میل چوڑا ہے، لوگ ریڈ انڈین، ہسپانوی، منگول اور حبشی النسل ہیں لیکن نسلی تعصب سے دُور ہیں۔ پورٹوریکو میں طبقاتی امتیاز تو ہے نسلی امتیاز نہیں، پندرھویں صدی کے اواخر سے چار سو برس تک ہسپانوی اس جزیرے پر قابض رہے، وہ سخت گیر اور مطلق العنان حکمران تھے، عوام کی حالت ابتر تھی، کاشت کار حقِ ملکیت سے محروم تھے، خانہ بدوش قسم کے لوگ۔ جہاں کام مل گیا کر لیا، اُن کا سفری آشیانہ 'بوھیو' کہلاتا تھا، دلدل میں ٹیڑھے میڑھے بانسوں کا ڈھانچہ کھڑا کر کے اُسے پام

کی شاخوں سے ڈھانپ دیتے ۔ برہنہ پا، دائمی مقروض اور تنگدست، بیشتر بخار اور پیٹ کے امراض میں مبتلا، دوسری جنگِ عظیم تک شکر سازی کے کارخانے معدودے چند لوگوں کی ملکیت تھے، لاکھوں ایکڑ اراضی بھی اُنہی کے قبضے میں تھی جہاں نیشکر کی کاشت ہوتی تھی ۔

بے چارے ہسپانوی "منانا" یعنی "آج کا کام کل پہ ڈال دو" کے لیے بدنام ہیں، لیکن پورٹوریکو نے گزشتہ پندرہ سال میں نیا جنم لیا ہے، امریکہ اور پورٹوریکو کے مابین دولتِ مشترکہ ایسا رشتہ ہے جس کے تحت جزیرہ اندرونی معاملات میں خود مختار ہے، دفاع کی ذمہ داری امریکہ پر ہے، حکومت تعلیم اور صحت پر آدھا بجٹ خرچ کر رہی ہے، صنعت کے میدان میں امریکی اثر نمایاں ہے، گزشتہ چند برس میں آٹھ سو کارخانے لگائے گئے ہیں جس سے ثانوی صنعتوں کو تقویت ملی ہے، ٹیکس میں رعایت امریکی سرمایہ داروں کے لیے باعثِ کشش ہے، فی کس آمدن میں چار گنا اضافہ ہو چکا ہے ۔ لوگ مستقبل کے متعلق پُرامید ہیں، احساسِ کمتری کی بجائے خود اعتمادی کی جھلک ہے ۔

ہسپانوی ثقافت کا دور دورہ ہونا ایک قدرتی بات تھی، آج اُس کی ٹکر امریکی ثقافت سے ہو رہی ہے، لڑکے لڑکیاں امریکہ کی آزاد روی کے دلدادہ ہیں گو اُنھیں احساس ہے کہ اُن کی روایات قدیم ہیں اور عظیم بھی۔ خاندان کی یک جہتی قائم ہے، ماں یا بیٹیاں کما رہی ہوں تب بھی خانگی معاملات میں باپ کا حکم چلتا ہے، بڑے شہروں میں دوشیزاؤں کے ساتھ محافظ خادمائیں نہیں جاتیں لیکن اتنی آزادی بھی نہیں کہ کوئی لڑکی "ویک اینڈ" باہر گزار سکے ۔

ہسپانوی کلچر کا اثر ہے کہ ایک خوبصورت عورت کو دیکھ کر منچلے چلّا اُٹھتے ہیں "کی وایا" واہ! کیا حسن ہے، سان واہن میں بس اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی ایک عورت کی طرف کار میں بیٹھا ہوا مرد جھوٹ موٹ یوں جھپٹا جیسے بندر کھانے کی چیز پر جھپٹے، اُس کی یہ حرکت نہ صرف نازیبا تھی بلکہ محض حماقت پر مبنی تھی، مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی کہ اس پچاس سالہ مُردے

کو کیا سوجی، سُرخ گول مول چہرہ، گنجا سر، چشمے کے شیشے بڑے بڑے لیکن حضرت اپنے آپ کو 'ڈان وان' سمجھتے ہوں گے!

ملک بھر میں نئے مکان 'اپنی مدد آپ' کے اصول پر بنائے جا رہے ہیں، ایک سرکاری ادارہ تعمیر کے دوران بلا اُجرت فنّی مشورہ دیتا ہے، عمارتی لکڑی کے لیے قرضہ مل جاتا ہے، مالک اراضی اور ہمسائے ہفتے میں ایک روز جمع ہو کر مکان بنا ڈالتے ہیں، اس طور چند برسوں میں سات ہزار مکان بن چکے ہیں۔

'فیلڈ ٹرپ' کے دوران کار دیہاتی علاقے کے نشیب و فراز طے کر رہی تھی، اُونچی گھاٹیاں ہموار میدان، شاداب وادیاں، 'فلیمبو' کے سبز پتّے اور خوشنما پھول ہواسیں جھول رہے تھے کہ کوئی اُنہیں گھر سجانے کے لیے چُن لے، بید کی لُنبک شاخیں۔ جیسے کسی صنّاع نے سبز پنسل سے لکیریں کھینچ دی ہوں، کنول کے پھول اور کوکونٹ پام کے جھنڈ مشرقی پاکستان کی یاد دلا رہے تھے۔ پھولوں سے لدا ہوا خطّہ خاموش تھا جیسے کسی دل دہلا دینے والے واقعہ کا منتظر ہو' ۱۹۵۶ء کا بے رحم طوفانِ باد و باراں اِرد گرد تباہی مچاتا ہوا ۱۸۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گزرا تھا۔

چمکتا ہوا سورج، گرم مرطوب ہوا، لامتناہی سبزہ، دھوپ چھاؤں کا دلربا منظر، گھنیرے بادل اور بوندا باندی ــــــ خطِ سرطان کا یہ جزیرہ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدل رہا تھا، میرا ساتھی لافایرے باخبر آدمی تھا، وہ مجھے زراعت کا کام دکھلا رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ ہر موضوع پہ روانی سے گفتگو کر رہا تھا، ہندوستان اور پاکستان کے مابین پانی کی تقسیم کا قضیہ، کشمیر کے متعلق پنڈت نہرو کا نظریہ، بین الاقوامی قصّے ــــــ "گزشتہ چند برسوں میں اقتصادی ترقی کو بڑی اہمیّت دی گئی ہے، ہم لوگ اپنی نشاۃ الثانیہ پہ فخر کر سکتے ہیں، سرکاری افسر ایماندار ہیں اور اصولوں پہ سختی سے کاربند ورنہ لاکھوں کروڑوں کی بیرونی امداد ضائع ہو جاتی"۔ لافایرے سنجیدگی سے باتیں کر رہا تھا لیکن اُس کا ہسپانوی نژاد ہونا کیسے چھپتا، لبِ سڑک ایک دفتر میں

داخل ہوئے تو ایک خاتون کو یہ کہہ کر متعارف کرایا کہ عورتوں کے پروگرام کی انچارج ہے، ساتھ ہی فقرہ چُست کر دیا "شادی کو تھوڑا عرصہ گزرا ہے لیکن اُمید سے ہے"۔ لڑکی نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ آنکھیں جھکا لیں۔

دیہی ترقیاتی ادارے برابر کام کر رہے ہیں، سُورج چھُپے لافابرے نے ایک گاؤں میں شہریت کے متعلق ایک فلم دکھائی پھر تختہ سیاہ کی مدد سے بحث کا آغاز کیا اور لوگوں کے سوالات کا جواب دیتا رہا۔

جاگیردارانہ نظام کے باوجود ہمارے ہاں عام لوگوں میں ایثار کا جذبہ موجود ہے۔ خصوصاً جب خیرِ کثیر پیشِ نظر ہو، ضلع گجرات کے غریب کسانوں نے پینتیس میل لمبی سڑک بنانے کے لیے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کی تھیں اور زمین کے لیے کوئی معاوضہ نہ لیا، اسی ضلع کا ایک زمیندار دوڑ میں انعام حاصل کرنے کے لیے کتّوں کو مکھن کھلا رہا تھا، میں نے دبے لفظوں میں کہا کہ یہ خوراک انسان کو بھی میسّر نہیں تو جواب ملا "یہ بھی اللہ میاں کی مخلوق ہے!"

سڑک نہ ہونے کی وجہ سے پشاور کے ایک دیہات سے پھل اور سبزیاں منڈی تک نہیں پہنچ پاتی تھیں، آڑھتی کھڑی فصل اونے پونے خرید لیتے تھے، ایسے علاقے میں جہاں ایک پھلدار درخت کاٹنے پر خون ہو جاتے ہیں ایک مالک نے اپنے باغ کے دس درخت کاٹ ڈالے تاکہ علاقے کی اجناس منڈی تک پہنچانے کے لیے راستہ بن سکے! افسوس حکومت کے ہاں ان جیسے اچھے کارکنوں کی قدر نہیں، سرکاری اہل کار شاذ ہی ایسے موقعوں پر مدد کرتے ہیں۔

ونیلڈا ساں واہن یونیورسٹی میں عمرانیات پڑھاتی ہے، مختلف شعبے دکھانے کے بعد اُس نے تجویز کیا کہ رات کا کھانا "مےکیوا" میں کھایا جائے "تم وہاں پورٹوریکن ماحول پاؤ گے" ریستوران اسم بامسمّیٰ تھا، عمارت کو "کیو" یعنی غار کی شکل دی گئی تھی، دھیمی روشنیاں

پرانی وضع کی لالٹینیں اور فرنیچر، ونیلڈا نے بتایا کہ وہ تین برس اپنے ہم وطنوں کو نیویارک میں بسانے کا کام کرتی رہی، امریکن اور پورٹوریکن کلچر میں تضاد ہے، پہلے پہل پورٹوریکن وہاں جاتے ہیں تو ذہنی اُلجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہی اُن کی بے راہروی کا سبب ہے، خاندانی بندھن مفقود ہوتے ہیں اور اپنے عزیزوں کے پیار کو یہ لوگ ترستے ہیں" نیویارک میں اپنے ہم وطنوں کی کس مپرسی کے خیال سے ونیلڈا کی آنکھیں بھر آئیں۔

" زندگی ایک غار کی مانند ہے، ہم میں سے بیشتر غار میں مقید رہتے ہیں اور ظلمت میں زندگی گزار دیتے ہیں، چند ایک زندگی کا تماشا غار کے دروازے سے دیکھتے ہیں۔ تھوڑے ہی ہوں گے جو ہوا خوری اور روشنی کی خاطر باہر آتے ہوں"۔ ونیلڈا فضا میں دیکھتے ہوئے فلسفیانہ گفتگو کر رہی تھی۔" میں سوچتی ہوں ہم ایک جہاز پر سوار تھے جو چٹان سے ٹکرا کے پاش پاش ہو چکا، ہم نے جہاز کے تختے تھام لیے ہیں، اب لہروں کے رحم وکرم پر ہیں کہ جہاں چاہیں لے جائیں"۔

مغنّی گا رہا تھا " موسم کے تغیّر کے ساتھ ساتھ پرندے ساحل بہ ساحل کوچ کرتے ہیں۔ دراصل وہ نئے موسم کے پیشرو ہیں، بسا اوقات نیا موسم انسان کی قسمت میں تبدیلی کا باعث ہوتا ہے"۔ دو لڑکوں کے ہاتھوں میں گٹار تھے، تیسرا تالی بجا کر تال دیتا یا دونوں ہاتھوں میں مراکس تھام کر اُنھیں جھنجھناتا، گانے کا ارتعاش غار کے کونے میں گونج رہا تھا، ہم لوگ گٹار کی دھنیں محویت سے سُن رہے تھے کہ ونیلڈا نے کہا" ویٹر دو دفعہ بل لایا لیکن ہماری محویت دیکھ کر لوٹ گیا، دُنیا کے کسی کونے میں تم اتنی شائستگی نہیں پاؤ گے۔"

ونیلڈا موڈ میں تھی اور بے تکان بولے جا رہی تھی۔

" کچھ عورتیں دنیاوی کامیابی کی خاطر نسوانیت کا گلا گھونٹ دیتی ہیں، وہ اپنے آپ کو ہشیار سمجھتی ہیں اور ہر میدان میں مردوں کے مقابلے پر اُتر آتی ہیں، مرد دل برداشتہ

ہو جاتے ہیں۔ آپ ہی کہیئے "شیولری" کی سپرٹ کیونکر قائم رہ سکتی ہے۔ مرد کے دل میں عورت کے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہتی، لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف وہ راہ راست پر ہیں اور جس نے اُس راہ سے انحراف کیا لائقِ الزام ہے، طوائف کا پیشہ لے لیجئے، کوئی یہ سوچنے کے لیے تیار نہیں کہ اُس نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا، بس یہی سُننے میں آتا ہے کہ یہ قابلِ نفریں طبقہ ہے، انھیں شہر بدر کر دو جیسے یوں کرنے سے سب گناہ دُھل جائیں گے اور انسانیت ایک نئے طور سے جنم لے گی، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں طوائف کو برداشت کر لینا چاہیئے، گویا وہ اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہیں، ایک طوائف کا بھی دل ہوتا ہے، ذرا سوسی وانگ کی کہانی پڑھ کے دیکھئے۔"

ونیلڈا ایک یہودی نوجوان سے محبت کر چکی تھی، اُس نے گفتگو کا رُخ بدلا، کہنے لگی،

"یہودیوں کی مثال لیجئے، ہٹلر نے اُن پر ستم ڈھائے، سٹالن نے اُنھیں ستایا، کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ مذہبی اختلاف کی بنا پر سختی روا رکھے؟ مَیں پروٹسٹنٹ ہوں، پورٹوریکو میں ہم ایک چوتھائی ہیں باقی کیتھولک ہیں لیکن یہاں کوئی تلخی نہیں، میرے لیے مذہب فلسفۂ زندگی ہے، عقیدہ نہیں، میرا اور خدا کا رشتہ ایک ذاتی مسئلہ ہے، دو دلوں میں محبت ہو تو مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے، یہ بندھن مضبوط نہ ہو تو سو حیلے تراشے جاتے ہیں، مَیں ایک "موئے آمبرے" یعنی مردِ کامل کی تلاش میں تھی لیکن مجھے ایک ناپختہ نوجوان مل گیا، یوں وہ کمسن نہ تھا، امریکی فوج میں افسر تھا، شادی کی بات میں پہل اُس نے کی تھی لیکن آٹزک کی ماں نے صاف کہہ دیا،

"ایک تو تم عیسائی ہو پھر طرفہ یہ کہ پورٹوریکن ہو، اس سے کیا فرق پڑتا تھا، بس کہنے کو بات ہاتھ آ گئی۔ . . . ."

ہم یونیورسٹی تھیٹر میں فرنچ بیلے دیکھ رہے تھے، "سوین آف لیک" کا رقص ختم ہوا تو ونیلڈا نے کہا:

"لیکن خدا کی دنیا وسیع ہے، اُس کی مخلوق میں، ان تماش بینوں میں کہیں نہ کہیں مجھے وہ "موئے آمبرے" مل جائے گا جس کی مجھے تلاش ہے، جو میرے خیالات کا ساتھ دے سکے"

"سچ کہتا ہوں تمھیں مل کے بہت خوشی ہوئی۔"

"میرے خیالات میں کنفیوژن ہے نا اس لیے!"

"یہ بات نہیں، تم میں صداقت ہے، تشکی ہے۔ تم ضرور ان اُلجھنوں پر قابو پالو گی۔"

ونیلڈا کی آنکھوں میں خلوص کی چمک تھی، وہ آنکھیں جو نیویارک میں اپنے ہموطنوں کی تکلیف سے پُرآب ہو جاتی تھیں اپنی تکلیف پر مسکرا رہی تھیں۔ یہ آنکھیں لیا ریویرا کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں سے مختلف تھیں، لیاّ کی سیال آنکھوں کی چمک جیسے ہیرے جواہرات کوٹ کوٹ کے بھرے ہوں، اُس کا چچا تُلا انداز، تپے تُلے الفاظ، سگریٹ کے کش، لیکن وہ بھی خلوص سے بے بہرہ نہ تھی، معزز خانوادہ ریویرا کی چشم و چراغ کو اعتراف تھا کہ بچپن میں سہیلیوں کے سامنے وہ اپنے خاندان کا ذکر فخریہ انداز میں کرتی تھی، اب گھرانہ آسودہ نہ تھا، باپ کو کینسر تھا اور سب ذمہ داریاں لیاّ کے سر تھیں۔

انٹرول ہونے پر باہر آئے تو میں نے ونیلڈا سے پوچھا

"آپ کا پتہ؟"

اُس نے بتلایا

"آپ کی آنکھوں کا رنگ؟"

یہ میں نے اس بے ساختگی سے پوچھا کہ خود مجھے ہنسی آگئی،

"یہ کیا مذاق ہے!" ونیلڈا نے بناوٹی جھلاہٹ کے ساتھ کہا، لیکن یہ سچ تھا کہ اُس کی آنکھوں کے متعلق قطعی کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ونیلڈا کی آنکھوں میں وہی گمشدگی اور از خود رفتگی تھی جو اُس کی باتوں میں تھی، ہمارا نیپالی ساتھی تشاسترا لیاّ کے خیال میں مست تھا، نیپال کی شاداب وادیاں، مست ہرن، تازہ پگھلی ہوئی برف سے لبریز آبجو، پُراسرار

جھیلیں اور لیا کی آنکھیں!

وطن سے ایک خط ملا، میرا دل بیٹھ گیا، جذبات آزردہ ہو گئے، مٹھی بند کر کے سگریٹ کا "سوٹا" لگانے والا نذیر تپ محرقہ سے جانبر نہ ہو سکا تھا، وہ زندہ رہتا تو چند سال میں سپرنٹنڈنٹ ہو جاتا لیکن اکاؤنٹس گتھیاں سلجھانے والا، گولی کی طرح نشانہ خطا نہ کرنے والا نذیر زندگی کی دوڑ قبل از وقت تھک گیا تھا، وہ اس عظیم الشان انبوہ سے علیحدہ ہو گیا تھا جو دن رات چلتا رہتا ہے، تگ و دو ایسی ہوتی ہے کہ ہم منزل بھول جاتے ہیں، یہ بھول جاتے ہیں کہ اس کش مکش کا مقصد کیا ہے، وہ جواں سال مر گیا، ایک وفادار ساتھی ساتھ چھوڑ گیا لیکن اس کی وفات کی خبر اخباروں میں جگہ نہیں پائے گی، وہ کوئی بڑا آدمی نہیں تھا........
اُس کے گریبان کے بٹن ہمیشہ ٹوٹے ہوتے، قمیص کا کالر مڑا ہوا، چھوٹے چھوٹے بال کنگھی سے محروم، مجنونانہ کیفیت، سر نیہوڑا کے کھڑا ہونا، اُس کی صحت کبھی بھی اچھی نہ تھی، دوپہر کے کھانے کی بجائے ایک چائے کی پیالی اور توسٹ کا ٹکڑا۔ یہ تھی ایک کلرک کی زندگی لیکن اُس نے فرار کا طریقہ ڈھونڈ لیا تھا، رات اسی اُدھیڑ بُن میں گزری، دھیمی ہوا میں ٹراپیکل جنگل کا جادو بیدار ہو رہا تھا، ایلامینڈا کے پھولوں پر زرد گلاب کا دھوکا ہوتا تھا۔........

صبح کاذب تھی کہ ہم آبشار دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے، دریا پہ دھنک کا سائبان تنا تھا، علی الصبح مرمریں آبشار کا روپ دید نی تھا، نور کا دھارا اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو رہا تھا، لاکھوں سنگ زدہ قطرے منتشر ہو کر اُبھرتے اور مہین چادر کی صورت اختیار کر لیتے، وہ اس بات کی خبر دے رہے تھے کہ اُن کے ساتھیوں پہ کیا بیتی ہے، نورانی چادر نے بے رحم پتھروں کو چھپا لیا تھا اور زیریں حصّے میں گم ہونے والے آبشار کو بھی، طلوعِ آفتاب کی کومل کرنیں جب پرّاں قطروں سے ٹکرائیں تو قزح کی عظیم کمان بن جاتی جو دریا پہ تاج کی طرح جلوہ فگن تھی۔

قوس قزح ہو کر انسانی مسرّت اسے مقیّد کر لینا انسان کے بس میں نہیں، پتھروں سے

ٹکرا کے قطرے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں اور سُورج کی شعاعیں اُن پہ قوس بُن دیتی ہیں، انسانی رنج و راحت کی کیا حقیقت ہے؟ دھنی ہوئی قزح کے پھیلے پھیلے خوبصورت رنگ اور آبشار کے پہلو میں اُس کا بار بار بننا بگڑنا کیا اس بات کی شہادت نہیں کہ غم اور مسرّت دیرپا نہیں، وہ مسرت کا لمحۂ عالیہ ہو یا غم و اندوہ کی جانگداز ساعت!

جہاز ساں واہن کے ہوائی مُستقر سے اُڑا تو لہریں سطحِ آب پر دیدہ زیب PATTERNS بنا رہی تھیں۔ پانی کے تودے سمندر سے اُبھر رہے تھے جیسے کنارِ آب نیلی پہاڑیاں ہوں یا بپھری ہوئی لہریں بلند ہو کر منجمد ہو جائیں۔ دوسری جانب بادلوں کی دبیز تہہ تھی، سحاب کی سفید چادر پر نیلگوں آسمان کا سایہ پڑ رہا تھا، غروب آفتاب کا ایک یادگار منظر، مغرب کے حاشیے پر پگھلے ہوئے سونے کی حکمرانی تھی، دُور اُفق پر سنہرا رنگ بتدریج ہلکا ہو گیا تھا اور بعد نیلا آسمان، میں نے آسمان میں ایسی نیلاہٹ کبھی نہیں دیکھی تھی جیسے پاکیزہ آسمان طلائی تخلئے سے کہہ رہا ہو "تم گھڑی دو گھڑی کے مہمان ہو، میں قدیم ہوں، عتیق ہوں، جب تک دُنیا قائم ہے، عناصر کی خاصیتیں قائم ہیں تب تک مجھے بھی بقا ہے۔"

تاریکی پھیلنے لگی، رنگ گہرے ہو چلے، سنہرا، نارنجی، پیلا، سبز، نیلا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ راجہ دھنش کی کمان نہ تھی جو ایک لکیر کی طرح فضا میں کھچ جاتی ہے بلکہ آسمان اور سمندر کے درمیان قوس کے رنگ معلق ہو کے رہ گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں "ڈاؤن ٹاؤن" سان فرانسسکو کے ایک قہوہ خانے میں ناشتہ کر رہا تھا کہ مالک نے ایک گاہک سے کہا "بل میری بیوی کو ادا کر دیجئے"۔ میں نے برسبیل گفتگو مالک سے کہا "معلوم ہوتا ہے اِس ملک میں بھی بیگمات پرس کنٹرول کرتی ہیں"۔ "یہاں عورتیں ہر کام میں برابر کی شریک ہیں، تمہارے ساتھ جو دو عورتیں کوفی پی رہی تھیں ٹیکسی چلاتی ہیں"۔ ایک صاحب نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا، چھوٹا قد، گٹھا ہوا جسم، نچلا ہونٹ موٹا اور اُبھرا ہوا، سر پر گرم کپڑے کی چھجے دار ٹوپی۔ میں ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ اُس نے دوسرا

موضوع شروع کر دیا" اس ملک میں "لابینگ" کا بہت رواج ہے، فرنیچر خرید و تو برابر کئی سال اصل پہ سُود دینا پڑتا ہے حالانکہ قسط کی ادائیگی کے ساتھ اصل گھٹنا چاہیئے، فرنیچر بنانے والوں کی "لابی" اتنی مؤثر ہے کہ رائے عامہ بے بس ہو کے رہ جاتی ہے، سفید پوش طبقے کی کوئی یونین نہیں حالانکہ ان لوگوں کو متحد ہونے کی ضرورت ہے، مالکوں کو دیکھو! لاکھوں یہ ثابت کرنے کے لیے خرچ کر دیں گے کہ یونین غیر قانونی ہے لیکن مزدوروں کو نہیں دیں گے۔"

ٹیڈ بات کرتا کرتا میرے ساتھ قہوہ خانے سے نکل آیا اور چوراہے پہ کھڑے ہو کر اپنے نقطۂ نظر کی شدّ و مد سے وضاحت کرنے لگا، میری ٹانگیں جواب دے رہی تھیں، مَیں دل میں کہہ رہا تھا "خدا کے لیے مجھے معاف کر دو اور جانے دو، سوا دس بج رہے ہیں، میرا ساتھی ہوٹل سے نکل جائے گا" لیکن توبہ کیجیئے "فصیح الزماں" بولے جا رہا تھا "تم کہہ رہے تھے کہ رتجگا کیا ہے، ساری رات ٹیکسی چلاتے رہے ہو تو اتنی انرجی کہاں سے آئی" لیکن میرے خیالات اُس کی روانی میں مخل نہیں ہو سکتے تھے، وہ کہہ رہا تھا" جانتے ہو چینیوں نے پانچ بلین درخت لگائے ہیں، کوئی پودا پنپ نہیں پاتا تو اُسے اُکھاڑ پھینکتے ہیں اور اُس کی بجائے دوسرا لگاتے ہیں، پانچ بلین کم نہیں ہوتے، روس میں ہر سال پچاس ہزار سائنس دان فارغ التحصیل ہوتے ہیں اور امریکہ میں صرف بیس ہزار! روسی اپنے سائنسدانوں کو بڑی مراعات دیتے ہیں"۔ میں سوچنے لگا ٹیڈ کا تعلق کسی سیاسی گروہ سے ہے یا وہ محض اُن لوگوں میں سے ہے جو ہر مسئلے پر اپنی ایک رائے رکھتے ہیں۔

سہ پہر کو ہم میور وُوڈ کی طرف رواں تھے جو سان فرانسسکو کے شمال میں ہے، ساؤ سالیٹو کا فیشن ایبل علاقہ راستے میں پڑتا تھا، ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ پہاڑیوں کی ڈھلوان پر ترشے ترشائے مکانات، ہوا کے بوجھ سے جُھکے ہوئے سفیدے کے درخت، بس ڈھلوان پر لڑھکتی تو پیچھے ہٹتی ہوئی بستی اپنے مکانوں اور درختوں کو سنبھالے بلندی

کی طرف اُٹھ جاتی ۔

بلند بالا ریڈ وُوڈ درختوں کی چھتری ایسی گھنیری تھی کہ سورج کی شعاعیں بمشکل فرشِ زمین تک پہنچ رہی تھیں، جنگل میں خنکی تھی، سردی کی وجہ سے پرندے اس جنگل میں بسیرا نہیں کرتے، کیڑے مکوڑے بھی شاذ ہی ہوتے ہیں، جنوبی کیلیفورنیا کے علاوہ ریڈ وُوڈ دنیا میں کہیں نہیں ہوتا، چند درخت دو ہزار برس پرانے ہیں ـــــ قدیم ترین جاندار چیز ـــــ بلند ترین درخت ساڑھے تین سو فٹ ہے، بجلی گرنے سے کچھ درختوں کے تنے زمین پہ آ رہے تھے جو دیکھنے میں بے جان معلوم ہوتے تھے لیکن ایک ایسے تنے سے متعدد درخت پھوٹ کر آسمان کی طرف بڑھ رہے تھے، ریڈ ووڈ کی زندگی جڑوں میں نہیں بلکہ چھال کے بیرونی دائروں میں ہے، یہی وجہ تھی کہ بجلی گرنے سے بھی درخت نیست و نابود نہیں ہوئے تھے، جلے ہوئے حصے پر ربڑ کے ٹائر کی طرح سیاہ حلقے پڑ گئے تھے لیکن تنے پر زندگی کی رمق موجود تھی، وہاں سے نئے درخت پھوٹ چکے تھے، چند درخت "مینارِ پیسا" کی طرح ٹیڑھے ہو گئے تھے لیکن کم سن درختوں نے سہارا دیکر انھیں تھام لیا تھا، ایک "مردہ" درخت کے کمان آسا ٹھنے پر بے شمار شاخیں اُگ رہی تھیں اور سیدھی آسمان کی طرف بڑھ رہی تھیں، گمان گزرتا تھا کہ اُن کے بوجھ تلے کمان زمین پر آ رہے گی لیکن ایسے موقع پر نوزائیدہ درخت زمین میں پاؤں گاڑ کے "ماں" کو سر پہ اُٹھا لیتے، فطرت نے طویل عمر بخشنے کا نیا حل سوچا تھا!

"اپنی پیٹی باندھ لیجئے، جہاز اُڑا ہی چاہتا ہے"۔ حروف سامنے چمک رہے تھے، ایر ہوسٹس کی بڑی بڑی براؤن آنکھوں میں بلا کی چمک تھی، چہرے پہ شگفتگی اور تازگی تھی، تندرستی اور بشاشت اُس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی، وہ میرے ساتھ والی سیٹ پہ بیٹھ گئی، "میں ابھی نو آموز ہوں، اتنی مشاق نہیں کہ ٹیک آف کے وقت چل پھر سکوں، یہ کیا زبان ہے جو تم دائیں سے بائیں لکھ رہے ہو؟"

جلد ہی روشنیاں دھیمی ہوگئیں، پسِ پردہ مدہم راگ تھا، سارا ماحول خواب آور تھا، آنکھ کُھلی تو دیکھا ملحق نشست پہ ایک خوش رو نوجوان محوِ خواب ہے، کچھ دیر بعد وہ چونک کے اُٹھا۔

"میں رات بھر جاگتا رہا، اب نیند نے غلبہ پا لیا۔"

"کسی دعوت میں پھنس گئے تھے؟"

"جی نہیں، ہم اسی جہاز میں لاس اینجیلز سے سان فرانسسکو گئے تھے۔"

"تو یوں کہیے برج کی چوکڑی جم گئی تھی۔"

"میں اِس جہاز کا پائیلٹ ہوں!"

اس تمہید کے بعد میڈگاسکی نے اپنی رام کہانی شروع کر دی، "میرا باپ ایک چھوٹے شہر میں پادری تھا، اُس کی خواہش تھی کہ میں اور میرا بھائی آبائی پیشہ اختیار کریں، بھائی مجھ سے کہیں زیادہ ذہین تھا لیکن اُس نے بے چُون چرا والد کی خواہش پوری کی اور معمولی مشاہرے پہ پادری بننا قبول کر لیا لیکن میرے دل میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی، سولہ برس کی عمر میں میں گھر سے بھاگ کھڑا ہوا اور لاس اینجیلز جا پہنچا، میں نے سختیاں برداشت کیں لیکن پائیلٹ بننے کی دُھن ایسی تھی کہ کسی قیمت پر گھر لَوٹنے کو تیار نہ تھا، میں نے معمولی مزدور کی طرح مشقت کی، کبھی ایسا بھی ہوا کہ کام نہ ملا اور رات کو کسی باغ سے سنگترے چُرا کے کھا لیے، دن کے وقت محنت کرتا اور رات کو نائٹ اسکول میں پڑھتا، ایرپورٹ پہ جاکر مختلف جہازوں کی ساخت دیکھنا میرا محبوب مشغلہ تھا، کسی کو میرا شوق دیکھ کے ترس آجاتا تو اندر سے جہاز کا انجن دکھلا دیتا، فنی تربیت کے لیے میں کسی اسکول میں داخل نہیں ہوا بلکہ اپنے طور کتابوں کا مطالعہ کر کے امتحان دیتا رہا، ایک لاکھ پتی نے مجھے اپنا ذاتی جہاز چلانے کی اجازت دے دی، یوں پائیلٹ لائسنس حاصل کرنے کے لیے پرواز کی شرط بھی پوری ہوگئی، جب میں سرخرو ہوکر گھر پہنچا تو والد نرمی سے پیش آئے۔ عجیب بات یہ تھی کہ

پڑوسیوں کو فخریہ بتلاتے تھے کہ مَیں ہوائی جہاز کا پائیلٹ ہوں، بڑا بھائی اب بیوی بچوں کے جھنجھٹ میں گرفتار ہے، افسوس اُس کی شخصیت گھُٹ کے رہ گئی"۔

سوانح کا حصّہ ختم ہوا تو میڈگاسکی ذہنی کشمکش کی دُنیا میں آگیا" مَیں نے زندگی میں ہمیشہ خلا محسوس کیا، مجھے حق کی تلاش رہی لیکن ہر دروازے سے بے نیلِ مرام لوٹا، میں نے فلسفے میں پناہ ڈھونڈی، برٹرینڈ رسل میرا پسندیدہ مصنّف ہے، فضامیں پرواز ایک حد تک طمانیت کا باعث ہے لیکن وقتی طور پر علائقِ دُنیا سے آزاد ہوتے سے سکون نصیب نہیں ہوتا"۔

"آپ کسی کے کام آسکیں تو شاید کچھ روحانی تسکین ملے؟"

"مجھے ایسے دوستوں کی تلاش رہی جو صدقِ دل سے فلاحی کام کر رہے ہوں لیکن مجھے مایوسی ہوئی"۔

"اپنی بساط کے مطابق انفرادی طور پر بھی ہم تھوڑا بہت کام کر سکتے ہیں گرد و نواح میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنہیں ہماری مدد کی ضرورت ہے لیکن ہمیں خبر تک نہیں ہوتی، کسی آفت رسیدہ کے لیے ہمدردی کا کلمہ یا اُس کی مشکل حل کرنے کے لیے ایک فون کال کبھی کبھار دولت سے زیادہ قیمتی ہوسکتی ہے"۔

میڈگاسکی خیالات کی دُنیا میں کھوگیا، اُس کا ردِّ عمل معلوم نہ ہوسکا،

موضوع کے اعتبار یہ ایک غیر معمولی اجتماع تھا، کاروباری اداروں میں مختلف عہدوں پر فائز چالیس امریکی مرد اور عورتیں اِس کورس کے لیے جمع ہوئے تھے، تنہا مَیں غیر ملکی تھا لیک ایروہیڈ لاس اینجلز سے تین گھنٹے کی مسافت پر جنوبی کیلیفورنیا کی پہاڑیوں میں واقع ہے، علاقے کی رعنائی سیاحوں کے لیے مسلسل کشش کا باعث ہے، بہت سے سیلانی جھیل میں کشتی رانی اور "واٹر اسکیئنگ" کے لیے آتے ہیں۔ ہماری آماجگاہ گاؤں سے دُور بجائے خود ایک دلفریب آبادی بن گئی تھی، مرتبع جھیل پر موٹر بوٹ دوڑتے، لڑکے لڑکیاں، مرد اور

عورتیں تیز رفتار کشتی کے پیچھے اپنے آپ کو بیلنس کر کے پانی پہ شہسواری، کے کرتب دکھاتے سرِ شام رُخسارِ آب کا رنگ بدلنے لگتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے فطرت کا مزاج بدل گیا ہے آسمان کا رنگ پانی میں منعکس ہوتا اور لہروں کی ہلچل بھی اس کی یکسانیت میں مُخل نہ ہوتی، ہر طرف آسمانی رنگ کا راج ہوتا، کچھ دیر بعد چاند کی کرنیں مچلتی ہوئی لہروں پہ چاندنی اور تاریکی کا عجب امتزاج پیش کرتیں اور جھیل کا زرق برق لباس آنکھوں کو خیرہ کرتا، باہمی تعلقات استوار کرنے کا سیمینار اس فضا میں منعقد ہو رہا تھا۔

ہم لوگ بیس بیس کے گروپ میں بٹ گئے، پہلی میٹنگ شروع ہوئی، اسٹاف کے ایک ممبر ہٹ کے ایک طرف بیٹھ گئے، کچھ تامّل کے بعد ہر ایک نے اپنا حسب نسب اور شغل بتلایا، جیسے ایک دوسرے کیساتھ راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کر رہے ہوں، زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں مَیں اچھا آدمی ہوں، اُمید ہے آپ بھی شریف انسان ہوں گے، مَیں آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں لیکن دو ایک روز میں ہی معلوم ہو گیا کہ اخلاص اور شرافت کا پردہ بہت مہین تھا، دورانِ گفتگو ہم نے ناصحانہ رنگ اختیار کیا، ایک دوسرے کی عیب جوئی کی، پھر نقائص دُور کرنے کے لیے ہمدردانہ مشورے دیئے، نکتہ چینی، طعنے جھپٹیں، کج بحثی، احساسِ برتری، ایک حمام تھا جس میں سب ننگے تھے، کوئی بہت بھدّا تھا، کوئی تکلیف دہ طور پر سنجیدہ (اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے!) کوئی باتونی، محفل پہ چھا جانے والا (واہ میاں افلاطون!) کسی کی ناک لمبی تھی یا توند حد سے بڑی، سبھی بھُولے ہوئے تھے کہ ہم مختلف انسانوں سے برتنے کا طریقہ سیکھنے آئے ہیں۔

جان نے کہا کہ جنگ کے فوراً بعد اُسے جاپان جانا پڑا، اُس کے کئی ساتھی شادی کیے بغیر جاپانی عورتوں کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتے تھے، جان کا اقرار کرنا تھا کہ یہ خرافات دیکھ کر اُسے احساسِ گناہ ہوا کہ یار لوگ پنجے جھاڑ کے اُس کے پیچھے پڑ گئے، ”ارے میاں لونڈے ہی نکلے، تمہارے خیالات میں ابھی پختگی نہیں آئی!“ جان کے کانوں

کی لوئیں سُرخ ہو گئیں، گروپ کی 'بڑی بی' جون اُس کے آڑے آئی،

"معصوم جان تو مجھے اچھّا ٹائپ معلوم ہوتا ہے، اُس کا ردِّ عمل ٹھیک ہی تو تھا، بے چارہ جان!"

کون کہہ سکتا تھا کہ ایسا بے ضرر اور بظاہر ہمدردانہ فقرہ ڈیوڈ کو شیرِ غرّاں بنا دے گا، فربہ اندام ڈیوڈ کا معمول تھا کہ کلاس میں آتے ہی آرام کرسی پر یوں دراز ہو جاتا کہ تولیہ نما بنیان میں سے اُس کی مدوّر توند نمایاں ہو جاتی، بیزاری سے اِدھر اُدھر تکتا جیسے گروپ کی بحث سے اُسے قطعاً دلچسپی نہیں، کسی بات سے اختلاف ہوتا تو ایسی جلی کٹی سناتا کہ بولنے والا ہکّا بکّا رہ جائے، عجیب آدمی ہے، مَیں نے ایک دو بار سوچا، 'معلوم نہیں یہ موٹا اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔

ڈیوڈ چلاّیا "جون تم ایسی عورتیں نوجوانوں کی تباہی کا باعث ہوتی ہیں"۔ بات بڑھ گئی، جون نے رونا شروع کر دیا لیکن ڈیوڈ کا دل نہ پسیجا، "یہ آنسو مجھے متاثر نہیں کر سکتے، یہ مسکینی اور دلگیری پتہ نہیں اس نے کتنی زندگیاں تباہ کی ہیں، میرا باپ بچپن میں مر گیا تھا، میری ماں نے مجھے پالا اور جوانی تک یہی حربہ استعمال کرتی رہی، اُس نے مجھے پنپنے نہیں دیا، جس جگہ مَیں نے جانا چاہا نہیں جانے دیا، دوست، جگہ، شغل، ملازمت، جو چیز اسے ناپسند ہوتی اُس کا مقابلہ آنسوؤں سے کرتی اور مَیں بے بس ہو کے رہ جاتا، اس عورت نے میرا کیریر برباد کر کے رکھ دیا۔ اے لوگو! جون ایسی عورت سے خوف کھاؤ، یہ مادرانہ شفقت زندگی تباہ کر سکتی ہے"۔ ایٹم کا سائنسدان ڈیوڈ دل کی گہرائیوں سے بول رہا تھا، چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے ظاہر تھا کہ اس کے زخم ہرے ہو گئے ہیں۔

مَیں نے ایک دو دفعہ گرین سے کہا کہ تم پادری ہو مگر جب شام کے وقت بھی سیاہ چشمہ لگا لیتے ہو تو شبہ ہوتا ہے جیسے کوئی انٹرنیشنل قسم کا 'کروک' ہو، یہ بات سُن

کے وہ ہنس دیتا لیکن اپنی عادت کا پکّا تھا، کلاس میں آتے ہی فرش پر لیٹ کر منہ ایک طرف کر لیتا اور سرِ شام بار میں کھڑے ہو کر خُوب وہسکی پیتا، ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا، پھر جانے کیا بات ہوئی کہ اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور خوابیدہ سوتے اُبل پڑے، ہر لہو و لعب میں بڑھ چڑھ کے حصّہ لینے والا بھُوری مُونچھوں والا گرین زار و قطار رو رہا تھا، سیاہ چشمے نے آنکھوں کو ڈھانپ رکھا تھا مگر رواں آنسو کہاں چھُپتے تھے، گرین کہہ رہا تھا "میرا باپ معمولی گھرانے سے تھا، اُس نے ایک اُونچے خاندان کی لڑکی سے شادی کی لیکن میرے ننھیال اُسے کبھی خاطر میں نہ لائے، وہ اُسے دہقان ہی سمجھا کیے، میرا مظلوم باپ! یہ جانتے ہوئے کہ مجھ میں اور اس کام میں بُعد المشرقین ہے میں نے پادری بننے کا فیصلہ کیا، یہی ایک پیشہ تھا جو محنت کیے بغیر مجھے لوگوں کی نظروں میں عزّت اور وقار بخش سکتا تھا!"

اگلے روز ہی ہلڈا کی باری آ گئی، دُبلی، دراز قامت، متوسط العمر ہلڈا۔ "میرا خاوند جنگ میں اپاہج ہو گیا تھا، وہ کوئی کام نہیں کر سکتا، میں روزی کمانے کے لیے مشقت کرتی ہوں، مجھے کوئی گلہ نہیں لیکن جب تھکی ہاری گھر لوٹتی ہوں تو مجھے دلاسہ دینے والا کوئی نہیں ہوتا، بچّوں کے علاوہ مجھے خاوند کی نگہداشت کرنا پڑتی ہے، کاش کوئی مجھے سہارا دے سکتا!"

جین ترا ہن کسی کالج میں پڑھاتی تھی، اُس کی باتوں میں مٹھاس تھی لیکن جب کہتی "میں تم سے بالکل متفق ہوں" تو مجھے آگ لگ جاتی، میں خوب سمجھتا تھا کہ وہ مجھ سے ذرہ بھر اتفاق نہیں کر رہی، جین بات بات پہ مسکرا دیتی لیکن بناوٹ اور ملمّع بھلا کہاں چھُپتا۔

"ان سے آپ ملی ہیں؟ ہمارے پاکستانی دوست!" کسی نے جین سے میرا تعارف کروایا۔ "جی ہاں! یہ ہمارے گروپ میں ہیں بلکہ ڈنر کے وقت میری میز پہ تھے، سچ

کہتی ہوں یہاں آکر ایسی پُرلطف نشست نہیں ہوئی تھی۔" جین ہاتھ باندھتا ہوں۔ جانے دو۔ کہاں تک بنوگی اور دُنیا کو بناؤ گی، دنیا سخت گیر ہے، ہنسنے والوں کو کہاں بخشتی ہے۔

پچاس سالہ پال اور مَیں ایک ہی کمرے میں مقیم تھے، وہ خوش خلق اور شریف آدمی تھا، یونیورسٹی میں فزکس کا پروفیسر رہا تھا، اب اُس کا قیام ایک فارم پر تھا، اُس کا کہنا تھا" دُنیا میں انسان کو انسان کی ضرورت ہے، باہمی تعلقات کے سلسلے میں لوگ مجھ سے مشورہ کرتے ہیں گو اپنی بیوی کے ساتھ میرے تعلقات ہمیشہ خوش گوار نہیں رہے، وہ سمجھ دار عورت ہے لیکن مجھے 'پیرانوئے' کی تکلیف ہوگئی تھی، ایسے لوگ نہ صرف حسّاس ہوتے ہیں بلکہ اُن میں احساسِ کمتری بھی شدّت سے ہوتا ہے، مَیں کبھی اپنے آپ کو حقیر کیڑا سمجھتا ہوں اور کبھی شہنشاہ! میری ماں کا خیال تھا کہ اُس کا بیٹا بہت بڑا سائنسدان بنے گا اور دُنیا میں نام پیدا کرے گا، مَیں بھی آئن سٹائن بننے کا خواب دیکھنے لگا، وہ خواہش تو کیا پوری ہوتی پروفیسری سے ہاتھ دھونا پڑے۔"

سیمینار کے اختتام پر ہم ایک دوسرے کو کسی حد تک سمجھنے لگے تھے، انسان اپنے دُکھوں کا بوجھ پیٹھ پر لادے پھرتا ہے، دیکھنے میں کوئی مطمئن نظر آتا ہے، کوئی مسرور کوئی مغموم، ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی سے محض اس لیے متنفر ہو جائیں کہ اُس کا اندازِ گفتگو مختلف ہے یا وہ زُود رنج ہے، اس کی تہہ میں ضرور کوئی بات ہو گی، نفسیات کی بہت سی گُتھیاں ہمدردانہ سلوک سے سُلجھ سکتی ہیں، تہذیب و تمدّن کی صدیاں گزرنے کے باوجود انسانی فطرت اک معمّہ رہی، انسان انسان کو نہ سمجھ سکا۔

پندرہ روزہ کی ایسوسی ایشن کیا ہوتی ہے لیکن پال کو اصرار تھا کہ واپسی پر لاس اینجلز میں مَیں اُس کے ساتھ کیلیفورنیا کلب میں ٹھہروں، مَیں نے ایک دو بار کہا مجھے ہوٹل میں جانے دو، آخر پال کے خلوص کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، کلب پہنچنے پر پال نے کہا، "جب تک تم لاس اینجلز میں ہو، میرے مہمان ہو، کوئی بل آئے تو اُس پہ میرا نام لکھ دو۔"

پال شائستگی کی تصویر تھا، اُسے ہمیشہ میری خاطر مقصود ہوتی جیسے اس اجنبی ملک میں مَیں اُسی کا مہمان ہوں۔

جاپان کی جانب طویل پرواز بے حد بے کیف تھی، جہاز کے انجنوں کا مدہم شور ایک تھکی ہوئی آواز کی مانند تھا، مسافر سیٹوں سے چپک کے رہ گئے تھے جیسے آسیب زدہ ہوں، کسی بددُعا کے زیرِ اثر اس سفر کا انت نہ ہو، باہر منظر کی یکرنگی طبیعت پہ گراں گزر رہی تھی، جہاز ساکت تھا، نیچے گدلا بحرالکاہل ساکت تھا، بچپن میں ریل کی تیز رفتاری کا اندازہ کھمبوں سے لگاتے تھے جو اُلٹی جانب بھاگتے تھے لیکن یہاں کوئی نشانِ راہ نہ تھا، سطحِ سمندر پر جہاز کا مجوب سایہ اس بات کا پتہ دیتا تھا کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں، سُورج بضد تھا کہ آج نہیں چھُپوں گا، وہ ہم سے اس پرواز کا انتقام لے رہا تھا جو 'ڈیٹ لائن' اور قدرتی نظام کے خلاف تھی . . . .

جاپان کے ساتھ چیری کے شگوفوں کی ایسوسی ایشن تھی، جاپان اُس پیارے افسانے کی یاد دلاتا تھا جو بہت سال پہلے ساقی کے سالنامے میں چھپا تھا، "جاپان میں رُومان" جس میں سرگشتۂ خمارِ رسوم وقیود' ایک جاپانی مصوّر اپنی فرنگی محبوبہ کی خاطر جان سے جاتا ہے .... ٹوکیو کا شہر خوابوں کی دُنیا تھی، چھوٹے چھوٹے گھروندوں میں رنگین کاغذی سکرین، لکڑی کے بنے ہوئے ننھے پُل، کمونو میں ملبوس عورتیں، مسکراتے ہوئے بچّوں کی آنکھوں پر ہلکی سی سوج' جاپانی ٹی گارڈن میں لالٹینوں کا ٹمٹمانا، مختلف وقتوں میں یہ خواب پورا تو ہوا لیکن خواب اور زندگی میں بُعد ہے اس لیے ٹوکیو کے تنگ اور کثیف گلی کوچوں میں مردوں اور عورتوں کا جمِ غفیر بھی دیکھا، پتھریلی زمین سے نانِ شبینہ نوچ لینے والے غیرت مند جاپانی نہ صرف رہنے کا قرینہ جانتے ہیں بلکہ محنت شاقہ بھی اُن کی گھُٹی میں پڑی ہے۔ یونیفارم پہنے ہوئے سولہ برس کی تنومند لڑکی ٹورسٹ بس کی کنڈکٹر تھی اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں بیحد مستعد، ہر اسٹاپ پہ پھُرتی سے باہر چھلانگ جاتی اور سیٹی بجا کر گاڑی ریورس کرنے میں مدد

دیتی، مقررہ وقت پر مسافروں کو گرم چائے پیش کرتی، پہاڑی علاقے میں بس ایک دلفریب مقام پر پہنچی تو لڑکی نے گانا شروع کر دیا گویا وہ بھی فرائض میں شامل تھا، باتوں باتوں میں اُس نے بتلایا "میرا گاؤں ٹوکیو سے سو میل کے فاصلے پر ہے، میرے ابا کی چھوٹی سی کاغذ بنانے کی فیکٹری ہے، ایک سال ہوا ملازمت کے لیے ٹوکیو آگئی تھی، ہماری رہائش اور خورد و نوش کا انتظام کمپنی کے ذمّے ہے گو تنخواہ سے رقم کاٹ لی جاتی ہے...

"آپ نے صبح آٹھ بجے کام شروع کیا، ٹوکیو لوٹنے پر آپ کی ڈیوٹی ختم ہو جائیگی؟"

"جی ٹوکیو رات کے آٹھ بجے پہنچیں گے، کھانے کے لیے ایک گھنٹے کی چھٹی ہوگی، نو سے گیارہ بجے تک میرے ذمّے بس کو دھونے اور صاف کرنے کا کام ہوگا......!"

"ہفتہ میں ایک دو چھٹیاں ہو جاتی ہوں گی ؟"

"ایک ماہ کام کرنے کے بعد چار روز کی رخصت ملتی ہے جو میں والدین کے پاس گزارتی ہوں۔"

تاکاشمایا کے ڈیپارٹمنٹ اسٹور کے ریستوران میں کھانا کھا چکنے کے بعد میں بل کی رقم میز پر رکھ کے چل دیا، مغربی رواج کے مطابق ویٹرس کے لیے کچھ ریزگاری چھوڑ دی تھی، کیا دیکھتا ہوں ویٹرس سکّے تھامے بھاگی آرہی ہے۔ "نو سر، نو ٹِپ، نو ٹِپ" میں حیران رہ گیا، مغرب میں ڈھٹائی سے کام لے کر ٹِپ رکھوا لیتے ہیں اور یہاں خودداری کا یہ عالم!

یہ ریستوران اسٹور کی سب سے اُوپر والی منزل میں تھا، کھانا کھا چکنے کے بعد مرد اور عورتیں نیچے جانے کے لیے بے تاب تھے، لفٹ کے دروازے پر خاصا جھمگٹا تھا، اتنے میں دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ چلے آرہے ہیں، لمبی ڈاڑھی، جبہ، پاؤں میں کھڑاواں، صورت سے کسی معبد کے راہب معلوم ہوتے تھے، دفعتاً راستہ پھٹ گیا، لوگ دو رویہ کھڑے ہو کر فرطِ عقیدت سے جُھک گئے اور وہ مسکراتے ہوئے لفٹ کے دروازے تک پہنچ گئے، جاپانیوں

نے مغربی طریقے اختیار کیے ہیں لیکن 'مغرب زدہ' نہیں ہوئے، ٹیل کوٹ پہنے ہوئے جاپانی مرد ملاقات کے وقت بار بار جھکتے ہیں جیسے رکوع کر رہے ہوں، کھانے کے آداب ہوں یا رہائش کا کمرہ بڑی حد تک پرانا کلچر کارفرما ہے۔

کابُوکی جاپان کا کلاسیکی تھیٹر ہے۔

اسٹیج ہماری عام اسٹیج سے چار گنا ہوگی، رنگوں کے استعمال میں جاپانی صنّاع کمال دکھا رہے تھے۔ طلوعِ آفتاب کی پیش کش ——— نورانی تڑکا پھر نارنجی رنگ کا سَیل اور طیّور کا چہچہانا، اسی طرح غروب کا منظر بالکل قدرتی تھا، اُودے رنگ کا دھواں وادی میں اُترنا شروع ہوا جیسے سرِشام گہرے سایوں کا نزول جاپان کی پہاڑیوں پہ ہوتا ہے، بجلی کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی، پس منظر میں بادل گرج رہا تھا، بین الاقوامی مقابلوں میں رنگوں کی آمیزش اور بہترین فوٹو گرافی کے انعامات جاپانیوں نے یونہی نہیں جیتے۔

ایک المیہ اسٹیج کیا جا رہا تھا، گردن زدنی آنکھوں سے نہاں بانس کی تیلیوں کے پیچھے ہو رہی تھی لیکن لوگوں کے چہروں سے خوف و ہراس عیاں تھا، ایک لق و دق صحرا سامنے تھا، سورج کی چمک بھی بے رونق تھی، یہ اُن ہولناک سفّاکیوں کی سزا تھی جو شہزادے نے روا رکھی تھیں، بے گناہوں کا خون اُس کے ضمیر کو ڈس رہا تھا، انسان صدیوں سے اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے کہ غارت گری سے اپنی عظمت کا سکّہ بٹھا سکے گا۔

ٹیسکونا کا رقص ایک قدیم اسطورہ سے متعلق تھا، وہ بہت سندر تھی اور اپنی محبّت میں مگن، اُس کا محبوب محاذ پر چلا گیا اور واپس نہ لوٹا، غم و اندوہ سے نڈھال ہو کر ٹیسکونا نے دریا کی لہروں میں اپنا چہرہ چھپا لیا تھا، خواب میں ٹیسکونا مشہور شاعر اکا ہیتو پہ ظاہر ہوتی ہے ....

ٹسک سار کشتی، پُرسکون سمندر، دہقانی ساز اور سحاب کا دزدیدہ نزول، کسانوں

کی اس بستی میں اکاہیتو نے بنسری پر لافانی محبّت کا نغمہ گایا، ٹیسکونا نے پروانہ وار آخری رقص کیا، پھر ہوا میں تحلیل ہوگئی، شاعر نے اسے چھُونے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن طلسم ٹوٹ چکا تھا، وہ شمعِ وفا جل بُجھی تھی۔

اقبال میرے لیے اجنبی تھا، ہانگ کانگ پہنچنے پر اُس سے تعارف ہوا لیکن مختصر قیام کے دوران اُس نے "راہبر، فلسفی اور دوست" کا حق ادا کیا، اقبال ڈاکٹر ہے اور پاکستانی، پہلی بار اُسے یہاں ملازمت ملی، اب یہیں کا ہو کے رہ گیا ہے۔ ہانگ کانگ کا جادو اُس پہ چل چکا ہے، اقبال کہہ رہا تھا "میں ہانگ کانگ میں کام کرتا ہوں لیکن رہائش کولون میں ہے، دوستوں نے کہا ہانگ کانگ میں مکان کیوں نہیں لیتے لیکن کم بخت خلیج کے نظارے سے جی نہیں بھرتا" اور یہ حقیقت تھی، کولون اور ہانگ کانگ کے درمیان تیز رفتار فیری آٹھ منٹ سے زیادہ نہیں لیتی لیکن ایسا دلکش نظارہ دُنیا میں شاذ ہی ہوگا، سینما میں منظر کو نکھار کر دکھانے میں فوٹوگرافر کے فن کو بھی دخل ہوتا ہے لیکن ہانگ کانگ کے جو سین LOVE IS A MANY SPLENDORED THING میں نظر آئے انہیں پیش کرنے میں مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا، فی الواقع یہ جگہ مصوّروں کی جنت ہے۔

ایک پہیّے والی ریل پہاڑ کا فراز منٹوں میں طے کرتی ہے اور وکٹوریہ پوائنٹ پہ اُتار دیتی ہے۔ سُورج چھُپ رہا تھا، نیچے خلیج ساکت تھی، کشتیاں دبے پاؤں آگے بڑھ رہی تھیں اور بادل جیسے آگ لگ جانے سے دھواں اُٹھے، پس منظر میں شعلے لپکیں لیکن دھواں اُن کی تُندی چھُپالے، اُونچے مکان منتظر ہیں کہ کب رات کا جادو جاگتا ہے اور گہما گہمی شروع ہوتی ہے، تب چینی نی یون سائینز جگمگ جگمگ کریں گی جو انگریزی نیون سائینز کی نسبت کہیں بھلی معلوم ہوتی ہیں، آخر چینی زبان کی اساس تصویر کشی پر ہے!

ایک کشتی کھاڑی کے کنارے ڈول رہی تھی، پالش شدہ فرش، نیلی ترپال کی چھت بے رنگ ہو چکی تھی، ملگجا بادبان، مچھلی رکھنے کے لیے بید کی ٹوکریاں، مرغیوں کا ڈربہ، دھان

کوٹنے کا ڈنڈا، سگریٹ کے پرانے ڈبوں میں مصالحے، بیر کے گتّے میں کپڑے کا دوسرا جوڑا، گول چھجّے دار ٹوپی، تام چینی کی چائے دانی اور چار پیالے، یہ تھی کل کائنات کشتی والوں کی، معمر عورت ایک لمحہ بھی آرام سے نہیں بیٹھی، گودام کشتی کے شکم میں تھا، وہاں سے راشن لے کے ہنڈیا چڑھائی، مرغیوں کو دانا دنکا ڈالا، تسلے میں کپڑے دھوئے، چھوٹی مچھلی سکھائی، حرکت میں برکت، بڑی مچھلی گوشت پوست سے عاری نقش بر دیوار ہے، اُس کا بھی کچھ ضرور بنائیں گے چاہے نقل ہی ہو، نوجوان عورت نے ساس کی نظر بچا کے ٹوٹے ہوئے آئینے کی مدد سے بالوں میں کنگھی کی، کپڑے بادبان کی رسیوں پر سوکھ رہے تھے، ملّاح کے کرتے پاجامے میں جا بجا پیوند لگے تھے، لوٹ جاتی ہے اِدھر کو بھی نظر کیا کیجے، ایک بزرگ نے کنارے سے جھک کے گوشت کے چھیچھڑوں کی پوٹلی دی جو بڑی بی نے سنبھالی، سخت محنت کی وجہ سے دونوں کے چہروں پہ خشونت آگئی تھی ......

سرِ شام اقبال ڈیوٹی پر فری ہسپتال جا رہا تھا،

بلدیہ ہانگ کانگ نے والنٹیر ڈاکٹروں کے تعاون سے یہ تجربہ کیا ہے۔ ہفتہ میں ایک بار شام کو چھ اور آٹھ بجے کے درمیان ڈاکٹر، ڈینٹسٹ اور امراضِ چشم کے ماہر میونسپل ہسپتال جاتے ہیں، کوئی نادار اُس وقت بلا معاوضہ علاج کروا سکتا ہے، اسکولوں میں تین لاکھ بچّے زیرِ تعلیم ہیں، اُن کا طبّی معائنہ اور ایکس رے سال میں دو مرتبہ ہوتا ہے، ہر بچّے کے پاس ہیلتھ کارڈ ہے جس پہ دانتوں اور آنکھوں کی حالت اور بیماری کی تفصیل کا اندراج ہے۔

"ہم معذرت خواہ ہیں جیٹ کومیٹ سروس آج کراچی نہ جا سکے گی، جہاز کا انجنیئر دفعتاً بیمار پڑ گیا ہے، آج شب ہمارے مہمان ہو کر سن یا ہوٹل میں قیام کیجئے۔"

بی۔ اے۔ او۔ سی کی طرف سے اعلان تھا، ایئر پورٹ سے لوٹے تو ڈائننگ روم میں پُر تکلّف کھانا چنا جا چکا تھا، کون کہہ سکتا تھا کہ اس بہانے بی۔ او۔ اے۔ سی۔ کے

جہاندیدہ نمائندے سے ملاقات ہوگی۔

"میں ایک مشہور فرم کا ایجنٹ تھا جو ہیرے جواہرات کا کام کرتی تھی، ہائے کیا وقت ہوتا تھا جب موتی کی لڑیاں سیاہ ریشم پر چمکتیں، ہمیں ٹریننگ دی جاتی تھی کہ قیمتی پتھر کو کس قسم کے کپڑے پہ سجائیں تاکہ نظروں میں کھُب جائے، میں نے حسین عورتوں کی نگاہوں میں حرص وگرسنگی دیکھی جب وہ ایسا قیمتی ہار دیکھتیں جس کی قیمت ادا نہ کرسکیں، وہ اُس چمک سے کتنی مختلف ہوتی جو ایک متموّل لیکن جوہر شناس عورت کی آنکھوں میں آتی تھی، جسے دیکھتے ہی میں بھانپ جاتا تھا کہ وہ ضرور خریدے گی، ۱۹۳۵ء کا ذکر ہے کہ پرنس خان ایک انتہائی خوش شکل سوسائٹی گرل کے ساتھ پیرس والی دکان پر آئے اور اُس سے پوچھنے لگے "تم آج میرے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاؤ گی، کھاؤ گی نا!" وہ متذبذب تھی لیکن بات کرتے کرتے پرنس نے ایک بیش بہا بریس لٹ اُس کی کلائی پر باندھ دیا، اُس زمانے میں بریس لٹ کی قیمت دو لاکھ فرانک تھی،" یور ہائنس میں ضرور کھاؤں گی، لڑکی کا تذبذب کافور ہو چکا تھا۔

یہ ۱۹۳۵ء کا پیرس تھا۔

یہ مارکوئیس بیون کوُ کا پیرس تھا۔

مارکوئیس بالکل بے کار تھا، خاندانی جائیداد کے علاوہ بے شمار گورنمنٹ بانڈ اور حصص تھے، وہ صحیح معنوں میں آرٹ کی پرکھ جانتا تھا، کامیڈی، تھیٹر اور سیاسیات پہ گھنٹوں گفتگو کرسکتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ بیٹھے سُنا کریں، اُس کے کمروں میں آرٹ کے نوادرات یوں بکھرے تھے جیسے روزمرّہ کے استعمال کی چیزیں ہوں، مارکوئیس کو شکوہ تھا کہ آرٹ کے قدر شناس باقی نہیں رہے، جب وہ پیرس کے گلی کوچوں سے گزرتا تو لوگ ٹوپی اُٹھا کر سلام کرتے تھے اور زیرِلب کہتے تھے "مارکوئیس بیون کوُ" اور وہ سونے کی 'مُٹھ' والی چھڑی سے جواب دیتا تھا۔

میرے دوست ۱۹۲۵ء کا پیرس گزر گیا۔
مارکوئیس ہیون کُو کا پیرس گزر گیا۔

اب ۱۹۶۰ء ہے!

"زندگی بڑی خوبصورت شے ہے، مَیں نے زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے،" سفید مونچھوں والا ایجنٹ کہہ رہا تھا،" بٹوارے سے پہلے کا ہندوستان، شملہ میں وائسرے کا دربار تھا، اُس نے ارمین کا کوٹ پہن رکھا تھا جس پر سنہرا کام ہو رہا تھا، راجے مہاراجے نواب باری باری آتے، جُھک کے سلام کرتے اور اپنی کُرسی پہ بیٹھ جاتے، جُھکتے وقت مہاراجہ بڑودہ کی کلائی سے جواہرات کی لڑی کھُل گئی، بیش قیمت پتھّر فرش پر بکھر گئے، مجال ہے جو مہاراجہ نے آنکھ تک جھپکی ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا، وائسرائے نے دربار کی کارروائی بند کر دی تاکہ خدّام جواہرات چُن سکیں، ہیروں کے بل کی ادائیگی کے وقت پولو کے شوقین مہاراجہ جے پور نے پانچ ہزار روپے سہواً زیادہ دے دیئے، مَیں واپس کرنے گیا تو اُس نے کہا' احمق نہ بنو، اِسے اپنے پاس رکھو، اس کے ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا'...... جنوبی ریاستوں کی امارت الامان والحفیظ! ایک دفعہ حکومتِ برطانیہ نے نظام سے لاکھوں پونڈ بطور قرض لیے تھے، اُس کے محلوں میں چاندی کے بنے ہوئے پتّے اور قیمتی پتھروں سے تراشے ہوئے پھل تھے .... مَیں اُس ملک کے کونے کونے میں گھوما جو اُس وقت ہندوستان کہلاتا تھا، کشمیر سے ٹراونکور تک مَیں نے دیکھا کہ حکمران زندگی سے کس طرح لُطف اندوز ہوتے تھے، اُن کے حرم، دولت کے انبار، شکار، صحنِ چمن میں حسین عورتیں تاکہ انسان کے اندر احساسِ حُسن بیدار ہو سکے ...." ایجنٹ کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی، اُس کا کہنا تھا کہ وہ مُنشیات کو ہاتھ نہیں لگاتا، کبھی کبھار کھانے کے ساتھ وائن لے لیتا ہے، بہر حال آج اُس نے خوب پی ہو گی، اس مسلسل گفتگو میں زبوں حال، نیم جان کسان کا ذکر کہاں تھا جس کے بل بوتے پر یہ لوگ دادِ عیش دیتے تھے۔

اُس بھوک کا ذکر کہاں تھا جو لاکھوں انسانوں کے چہروں پر ایک ازلی نشان کی طرح لکھ دی جاتی ہے، جنم سے لے کر مرگ تک، اور وہ یہ سوچ کے چپ ہو جاتے ہیں کہ ماتھے کا لکھا کون مٹا سکتا ہے! غیرت کا فقدان، احساس کا فقدان، بہو بیٹیاں چھن جانے کے باوجود بے حسی، ایک پیرِ تسمہ پا نہ تھا جو قدیم اور تاریک گناہ کی طرح اُن کے کاندھوں پر سوار تھا بلکہ راج کے ادنیٰ ملازم تک اپنے آپ کو راجواڑوں کے روپ میں دیکھتے تھے، کاش تم کسی غریب کے مہمان ہوئے ہوتے تو زندگی کی حلاوت کے ساتھ اُس کی تلخی بھی معلوم ہو جاتی، افسوس تم نے محدّب شیشے کا ایک پہلو دیکھا، ہندوستانی زندگی کی عظیم حقیقت تمہاری آنکھ سے اوجھل رہی۔

طویل سفر کی یہ آخری پرواز ہے، خدا کی دُنیا کتنی حسین ہے؟ گو اُس کی مخلوق قبیلوں میں بٹ گئی ہے، قریہ قریہ، شہر شہر، لیکن بنی نوع انسان کے لیے گرم جوشی اور ہمدردی ہر جگہ موجود ہے، کتنے اجنبیوں نے مجھ سے خلوص برتا، میرا اُن کا کیا رشتہ تھا؟ ......

گاہے دُنیا کی رنگینیاں دامن کھینچتی ہیں، گاہے خونِ جگر سے ہم آرزوؤں کی آبیاری کرتے ہیں، عمر بھر مجھے یہ جاننے کی تمنّا رہی کہ دھنک کے اُس پار کیا ہے؟ ست رنگ کمان کے سرے پر ضرور کوئی طلسماتی دُنیا ہو گی لیکن قوس کے اُس کنارے پہ کچھ نہ تھا، بس اک غیر مرئی خوشبو کا اثاثہ تھا، ایک تلطّف کی نظر، دو میٹھے بول!

از تو کرشمہ و ز خسرو عنایتے

۱۹۶۰ء

سونار دیش

بچھڑے دوستوں کے فراق میں دل تار تار ہے اور اُن گنجان آبادیوں کے لیے آنکھیں اشک بار ...... صدیوں سے بنگال کے باسی بپھرے ہوئے عناصر کا مقابلہ کرتے آئے ہیں لیکن جب دریا میں تلاطم نہ ہو تب بھی کہاں چین پڑتا ہے۔ نانِ شبینہ کی محتاجی مدام رہتی ہے۔ جب تھل اور روہی کے تپتے ہوئے صحرا سراب کی جھیل بن جاتے ہیں تب بنگال کی شادابی دل میں اُتر آتی ہے اور وہ شب و روز یاد آتے ہیں جو اُس سرزمین میں بسر ہوئے۔

پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کی شکست بڑا سانحہ تھا، اقتدار گیا، وقار گیا، سختیاں جھیلیں لیکن بنگالی مسلمان کا سر نہیں جھکا۔ اُس کے سینے میں بے اطمینانی کی آگ بھڑکتی رہی، برطانیہ کا اعتماد کھو دینے سے مسلم عوام صعوبتوں میں مبتلا ہوئے، اُنہیں سیاسی اور معاشی حیثیت سے کچل دینے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا گیا۔

انگریز سے شدید نفرت کے باعث اہلِ بنگال نے نعرہ لگایا ' فرنگی کی تعلیم نہیں لینی '، انگریزی تعلیم کی طرف رجوع نہ کرنا بدقسمتی کی ابتدا تھی۔ دوسری قوم نے اس کوتاہی کا پورا فائدہ اُٹھایا۔" واجب الحصول رقم کا دسواں حصّہ زمیندار اپنے پاس رکھے گا، باقی خزانۂ عامرہ

میں جمع کروا دے گا، اگر کچھ وصول نہ کر سکے تب بھی رقم جمع کروانی ہو گی ورنہ غروبِ آفتاب سے پیشتر زمینداری نیلام کر دی جائے گی۔" یہ تھا لارڈ کارنوالس کا دوامی بندوبست۔ امینوں منشیوں کی چاندی ہو گئی، سادہ لوح زمینداروں سے روپیہ بٹور کر وہی زمینداریاں اغیار نے خرید لیں، یوں بنگال کا نقشہ بدل گیا، زمین آسمان بدل گئے، زمین تنگ اور آسمان دُور ہو گیا، نیل کے فرنگی تاجر اور نئے زمیندار، یہ چکّی کے دو پاٹ تھے جس میں عوام پستے رہے۔

بنگال بیدار رہے، اِسے محض اتفاق نہیں کہہ سکتے، سیاسی شعور، یک جہتی اور مسائل پر تدبر آج کی بات نہیں، بیسویں صدی کے شروع میں تقسیمِ بنگال کے خلاف ایجی ٹیشن، ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی تاسیس، دونوں باتوں میں بنگال پیش پیش رہا، ایک قدم مسلم مفاد کے خلاف دوسرا حق میں، گرام گرام گھوم کے مولوی فضل الحق نے خود اعتمادی کے دِیئے جلائے۔ بجھے سینوں میں نئی جوت جگائی، عزم و توانائی، استقامت اور ولولہ، اُس مردِ خود آگاہ نے بنگال کو بہت کچھ دیا۔

ساٹھ ستر برس اِدھر یونین بورڈ کی تشکیل سے سیاسی بیداری کا آغاز ہوا۔ اسکول کمیٹی اور ڈسپنسری کمیٹی کی روایت قائم ہوئی۔ اجتماعی مسائل باہمی صلاح و مشورے سے طے پانے لگے۔

بیتے ہوئے سال چیئرمین یونین بورڈ کے چہرے پہ جھریاں ڈال گئے تھے لیکن اُس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی اور باتوں میں کھنک۔

"آپ نے بڑی ہمت کی کہ اسکول اور فرسٹ ایڈ سنٹر کی عمارت خود تیار کر لی۔"

"پرائمری اسکول تو سب بنا لیتے ہیں چاہے اس کے لیے ہر کھانے پر ایک مُشت چاول پس انداز کرنا پڑے۔"

"بند بھی لوگوں نے خود بنائے ہیں؟"

"یہ گزشتہ دو برس میں بنے ہیں، سمندر کے پانی سے گاؤں کی زمین ویران ہوگئی تھی۔ برسوں لوگوں نے بہت تکلیف اُٹھائی، کوئی پیداوار نہ تھی، بند بننے سے زمین کا بیشتر حصّہ قابلِ کاشت ہوگیا"

"اُس وقت کون چیئرمین تھا؟"

"جی دس برس سے میں ہی چیئرمین ہوں"

"تعجب ہے، یہی لوگ تھے، آپ ہی چیئرمین تھے، تب بھی متواتر کئی برس تکلیف برداشت کی، یہ بند اُس وقت تیار کر لیے ہوتے!"

"سچ پوچھئے تو ہر طرف مایوسی اور بد دلی تھی، لوگ بے حس ہوگئے تھے۔ یہ جانتے ہوئے کہ سب تباہ ہورہے ہیں کوئی کسی کا ہاتھ بٹانے کے لیے تیار نہ تھا۔ دو سال سے نیا جذبہ کارفرما ہے۔ ہمیں انتظامیہ کی پشت پناہی حاصل ہے، میرے بوڑھے بازوؤں میں طاقت آگئی ہے"۔ یہ کہتے ہوئے چیئرمین کا سینہ تن گیا، اور وہ بوڑھے سپاہی کی طرح جسے فرض کا احساس ہوا اٹین شن ہوگیا۔

جیسور کے جنوبی حصّے کی اور بات تھی، کیشب پور کے رہنے والے سمندر کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے، لہریں دندناتی ہوئی اندر گھس آتیں۔ وسیع رقبہ زیرِ آب آجاتا، یہ عمل ساٹھ برس سے جاری تھا، ناکارہ زمین زیرِ کاشت لانے کے لیے واپڈا نے ساحل کے ساتھ ساتھ مٹّی کے پشتے باندھ دیئے تھے، ساٹھ برس کی محرومی کے بعد دھان کی پختہ فصل سر اُٹھائے کھڑی تھی۔ کٹائی کے موقع پر جشن منایا جارہا تھا۔ میلوں کا سفر طے کرکے لوگ گاتے بجاتے آرہے تھے۔ مسرّت کی کرنیں اُن کے بُشرے سے پھُوٹ رہی تھیں۔

اِس تقریب کے لیے نظمیں لکھّی گئیں، لوک گیت ترتیب دیئے گئے، جلسہ شروع ہوا تو سازوں کے ساتھ گایا گیا:

سونار گاچے

ہماری مٹی سونا ہے
ہمارے کھیت لہلہا اُٹھے ہیں
انہیں ہوا کے نرم جھونکے لوری دیتے ہیں
سر سبز چراگاہیں رُوح کو آسودگی بخشتی ہیں
درختوں میں پھُول آ رہے ہیں
یہ نظارہ آسمان کو لُبھاتا ہے

اور جو بَدا ایجنڈے پر نہ تھی ہو کے رہی یعنی لوک ناچ ، یہ لوگوں کی بے پایاں خوشی کا ثبوت تھا ، فطری جذبے کا اظہار " سرکاری تقریب" کے ماحول سے کتنا مختلف تھا !

قدرت کی فیاضیاں اپنی جگہ تھیں اور اس کے ستم اپنی جگہ ، انہیں کے مابین اہلِ بنگال کی قسمت سوتی جاگتی ہے -

تے تُولیا ، پندرھویں کا چاند ، آشن کا مہینہ ، سینۂ دریا پہ منعکس لہریں جھلمل جھلمل کرتی تھیں ، دریا کا دایاں کنارا پارے میں نہا گیا تھا ، اُس اور وسیع پاٹ تاریکی میں لپٹا تھا ، چاند کو چھدرے سفید بادلوں نے گھیر لیا ، قزح کے پیارے رنگ بادلوں کے حلقے میں سموئے گئے ، کبھی ہلکا نیلا رنگ غالب آجاتا کبھی نارنجی ، چند لمحوں میں چاند بادلوں کی گرفت سے آزاد ہوگیا ، یہ چاند اور دریا کی دُنیا ہے ، یہاں کے باسی پورنماشی اور اندھیری راتوں سے گھبراتے ہیں ، ایسے میں پانی میں ہلچل ہوتی ہے ، ضرور کوئی آفت آتی ہے -- WATERY MOON SHEPHERDS WARNING چاند گدلا ہو تو گڈریئے کو چاہیئے ریوڑ کی حفاظت کرلے ، صاحبِ نظر دل کی حفاظت کرلے ، مصوّر کو چاہیئے رنگ تلاش کر رکھے ، چاند کے گرد اگرد

خوبصورت حلقے ہمیشہ نہیں رہیں گے، وقت کے ساتھ مُوڈ بدل جاتا ہے اور لمحۂ گرم پرواز کہیں دُور نکل جاتا ہے۔ یوں لمحۂ گریزاں کو رنگ میں مقید کرنے کی خواہش تشنہ رہ جاتی ہے۔

اگن مکھا میں پھر تلاطم تھا، اگن مکھا، آگ کا دہانہ جہاں جہاز رانوں کا پتہ آب ہو جاتا ہے۔ اسٹیمر کمپنی کے بڑے جہاز سہ پہر کے بعد اُدھر نہیں جاتے لیکن ننھا لوکا کھینے ہوئے دو آدمی لہروں کے سامنے سینہ سپر تھے، دریائے بوڑد، گورنگو اور چورمنی یہاں سمندر میں گرتے ہیں۔ یہ دریا خلیج بنگال کے دہانے پر مٹی لا ڈالتے ہیں جو چھوٹے بڑے جزیروں کو جنم دیتی ہے، جوعُ الارض اتنی شدید ہے کہ لوگ منتظر رہتے ہیں۔ جونہی نیا جزیرہ پانی سے اُبھرتا ہے آکر قابض ہو جاتے ہیں۔ چوڑے سینے والے جری لوگ، سخت محنت کے عادی، سیک ناؤ، پتلے پتوار اور طوفانوں سے پنجہ آزمائی، ان جزیروں میں ہسپتال نہیں، اسکول نہیں، مارکیٹ نہیں، ڈاک خانہ نہیں، یہ خود اپنے نگران اور محافظ ہیں۔ کبھی ساحل سے سوڈیڑھ سو میل جنوب میں ہوا کا دباؤ تند لہریں سینۂ سمندر سے اکھاڑ دیتا ہے، یہ لہریں جزیروں کو تاراج کرتی ہوئی نکل جاتی ہیں، ساحلی علاقہ ایسے ہلاکت خیز طوفان کی زد میں آیا تھا۔ دو جزیروں پر پانی کی دیوار پون گھنٹہ مسلط رہی تھی، بانس کے مکان اور جست کی چادریں پرِکاہ بن گئیں، جانوروں کے ریوڑ، عورتیں، بچے، بوڑھے بہہ گئے جو بچ رہے بے آسرا تھے۔

بیٹری چیک کرنے کے بعد ہوا باز نے لیور اپنی طرف کھینچا اور ہیلی کوپٹر فضا میں عموداً بلند ہو گیا۔ ہیلی کوپٹر کا خول سیلو لائیڈ کا تھا، اوپر نیچے، دائیں بائیں اور سامنے منظر کتاب کی طرح کھلا تھا جیسے بے پر کے پرواز کر رہے ہوں، بل کھاتا ہوا دریا —— اپنی جلالی قوت کے سامنے دریا کی کمر خم ہو رہی تھی، بنگال کے لوک گیت

دریاؤں کے غیظ و غضب اور انسان کی جدوجہد کا ذکر کرتے ہیں مگر دریا ذریعۂ زندگی بھی ہیں، طوفانِ باد نے دھان کی بالیاں اکھاڑ پھینکی تھیں، سُپاری کے جھنڈ تہس نہس کر دیئے تھے، جھونپڑوں کی چھت اڑا دی تھی لیکن جزیرے میں زندگی کے آثار باقی تھے۔ چاول اور دال کے قلیل ذخیرے سکھائے جا رہے تھے، فرسودہ دھوتی باندھے گھڑے اُٹھائے بیبیاں تالاب کی جانب جا رہی تھیں، زندگی عظیم چیز ہے، اُسے کچلنا ناممکن ہے، پوربو دیش یہ سختی جھیل لے گا۔ طوفان کی یلغار میں سپاری کے درخت کی طرح لچک جائے گا، صدیاں گزریں یہ خطّہ یہیں تھا، سیلاب تب بھی آتے تھے ....

مشرقی پاکستان آب و رنگ کی دنیا ہے، یہاں کنول کے پھُول تالابوں سے جھانکتے ہیں، سبزہ اور پانی کا حسین امتزاج عجب لُطف دیتا ہے لیکن سُندر بن کی رعنائی منفرد ہے۔

گنگا اور جمنا کے عظیم دریا سمندر کے دہانے پر مٹی ڈالتے رہے، خلیج بنگال کی لہریں یہ مٹی کاٹتی رہیں، صدیوں اِن تودوں نے موسموں کے بے رحم طمانچے کھائے اور یوں سُندر بن نے جنم لیا، گھمبیر جنگل پرورش کرتا ہوا سمندر تک آ گیا ہے۔ گنگوا، کیوڑا، بائن اور سُندری کے ذخیرے عام ہیں، لبِ ساحل گول پتّہ نے چوڑی چھتری تان دی ہے، سُندری کی مہک سے فضا بوجھل ہے، آدم زاد کے لیے سُندر بن "ممنوع علاقہ" ہے۔ روزی کمانے کے لیے جنگل میں جانکلنا جان سے کھیلنا ہے، کئی بار سننے میں آیا کہ آدم خور شیر بیس فٹ چوڑی کھال پھلانگ کے بندھے ہوئے نوکا سے ملّاح یا لکڑ ہارے کو لے اُڑا۔

پُراسرار جنگل، پُرشکوہ دریا، سائیں سائیں کرتے ہوئے خودرَو درختوں کے جھُنڈ، دریا سے دریا ملتے ہوئے، دریا کو دریا کاٹتے ہوئے، پُرپیچ و تاب کھال اور

دونوں طرف جنگل کا جادو، نیم خوابیدہ نیم بیدار، رنگارنگ پرندے، دُخانی بجرے کی آواز سے ہرن چوکڑی بھرتے ہوئے گھنے درختوں میں گم ہو جاتے مگر کچھ فاصلے پر دوسری ڈار پانی پینے کے لیے موجود ہوتی۔

کتنی دلکش تھیں یہ آوازیں

" دو بام ملے نا "

" تین بام ملے نا "

ملاح دریا میں ڈوری ڈالے مخصوص آواز میں گہرائی کا اندازہ لگا رہا تھا، کوُچ کے وقت غنائی گھنٹیاں بج رہی تھیں، بجرہ کنارے سے سرک کے گہرے پانی میں آرہا۔ سارنگ نے زندگی کے پچیس برس اسی بجرے پہ گزار دیئے تھے، یہیں ترقی کی منازل طے کیں، یہ لانچ جیون کا حصہ تھا، سفر اور حضر میں اسی پہ قیام تھا، گھنی سفید ڈاڑھی، لہجے میں تحکم، گذشتہ دس برس سے عبدالمطلب جہاز کا "کپتان" تھا، سالخوردہ سارنگ نہ صرف ناخوش تھا بلکہ شکار کے بہانے ہر چرند، پرند سے اپنی ناکامی کا انتقام لینے پر تُلا ہوا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ کم از کم ایک ہرن ہاتھ آ جائے، چلتے ہوئے بجرے سے اُس نے کئی فائر کیے لیکن نشانہ خطا گیا، اُتر کے جھاڑیوں کو ٹٹولا لیکن آہوئے رمیدہ زخمی ہوتا تو ملتا۔ دوسرے روز بجرہ وہیں لاکھڑا کیا جہاں ہرنوں کی ڈاریں پانی پینے آتی تھیں اور انجن بند کر دیئے تاکہ ہرن دہشت زدہ ہو کر بھاگ نہ جائیں، فضا نور سے لبریز تھی اور منتظر، نسیم سحر کی بدولت سینۂ دریا پہ لہریں ہلکورے لے رہی تھیں۔ شاید ہرنوں نے ایکا کر رکھا تھا کہ سارنگ کو شکر گزاری کا موقع نہیں دیں گے۔ دُور سے سفید دھبے دیکھ کر دو تین فائر داغ دیئے لیکن بے سُود، مایوس ہو کر چلے تو بطخوں کے جوڑے پہ نظر پڑی جو مزے سے تیرتا جا رہا تھا۔ فائر کیا تو بطخوں نے غوطہ لگایا اور بجرے کے نیچے سے ہوتی ہوئی

دوسری طرف نکل آئیں، بجرے کا سارا اسٹاف ریلنگ پہ کھڑے ہو کر سارنگ کو اپنی وفاداری جتلا رہا تھا۔ اُن کی نظریں بطخوں کی متلاشی تھیں۔ دو پرندے دس پندرہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن گئے تھے، سارنگ نے پھر فائر کیا، بطخوں نے پھر ڈبکی لگائی HIDE AND SEEK کا یہ کھیل دیر تک جاری رہا، اسٹاف نے سو میلے کیے کہ سارنگ صاحب نامراد نہ لوٹیں، کبھی بجرہ موڑا، کبھی گھما کے واپس کیا، کبھی نوکا پانی میں ڈال پتوار سے کھیتے ہوئے بطخوں کا تعاقب کیا لیکن جان کتنی عزیز ہوتی ہے، وہ برابر جُل دیتی رہیں۔ بعد از خرابی بسیار ایک بطخ زخمی ہو کر پکڑی گئی اور یوں سارنگ صاحب کی انا نے تسکین پائی۔

کرنافلی جاتے ہوئے زمرّدیں دریا ساتھ ساتھ بہہ رہا تھا، جنگلوں سے ڈھکی ہوئی نشیب لبِ دریا تک جا پہنچی تھی، دامنِ کوہ میں شبنم آلود پتّیاں سُورج کی اوّلین کرنوں میں چمک رہی تھیں۔ کیلوں کے جُھنڈ، بھیگی ہوئی گھاس، دُھنکے ہوئے بادلوں سے بچھڑتی پھوار کا نزول، سُنبل کے پھُول جوبن پر تھے، جہاں تک نگاہ جاتی وادی پھولوں سے پٹی پڑی تھی۔ سنبل میں رنگوں کی بہار تھی، آتشیں، عنابی، کیسری ....

فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ۙ وَّ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ۙ وَّ ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۙ وَّ مَآءٍ

بے خار کی بیریوں اور تہ بہ تہ کیلوں، اور لمبے لمبے سایوں، اور پانی کے جھرنوں،

مَّسْكُوْبٍ ۙ وَّ فَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۙ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ ۙ وَّ فُرُشٍ

اور میوہ ہائے کثیرہ کے باغوں میں جو نہ کبھی ختم ہوں اور نہ اُن سے کوئی روکے، اور اُونچے

مَّرْفُوْعَةٍ ۭ (سورۂ واقعہ)

اُونچے فرشوں میں۔

بجلی گھر میں پراجیکٹ انجینئر بُرہان الدین سے ملاقات ہوئی تو میں سوچنے لگا انسان زیادہ دلچسپ ہے یا فطرت؟ ہر شخص اپنی ذات میں ایک اکائی ہے اور منفرد

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

اُس نے اصرار کرکے مجھے پلانٹ دکھایا تھا، ہر چیز کی وضاحت کی تھی، بُرہان الدّین نے کہا "میں لوگوں کو سمجھاتا ہوں تم پاکستان کے طفیل تجارت اور سرکاری عہدوں پر قابض ہو۔ اس سرزمین نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا۔ یہ درست ہے عوام کی اکثریت تنگی ترُشی سے گزر کرتی ہے، اُن کی حالت سُدھارنے کے لیے مسلسل کئی برس محنت کرنی ہوگی لیکن افسروں کی ذہنیت دیکھئے، ریسٹ ہاؤس کے واجبات تک ادا نہیں کرتے، وہ یہاں مفت قیام اپنا حق سمجھتے ہیں۔

تعلیم کی بات چل نکلی تو برہان الدین نے آپ بیتی کا ایک ورق اُلٹا" اسکول تو موجود ہیں لیکن تعلیم ناقص ہے، جب دادا کا انتقال ہوا میرے والد تین برس کے تھے، بمشکل میٹرک کیا اور اسکول میں ملازمت کرلی، پرائیویٹ طور پر بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۴۸ء میں ایم۔اے کیا۔ وہ کاکس بازار ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں جہاں چھ سو بچّے زیرِتعلیم ہیں۔ ملازمت ختم ہونے کو ہے اب کہیں جاکر ساڑھے چھ سو روپے ملنے لگے ہیں۔ اُن کی خواہش تھی کہ ہم بھائی زندگی میں کامیاب ہوں، اُن کا فارغ وقت ہمارے لیے وقف ہوتا تھا، ہم سب نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ بڑا بھائی ایم۔ایس سی انجینئرنگ ہے، دوسرا ایم۔ایس سی نباتیات اور تیسرا ایم۔اے ایل ایل بی۔

کرنافلی سے لوٹتے ہوئے ڈاکٹر رُوح الامین میرے ہمسفر تھے، دس برس پہلے وہ ایم۔بی۔بی۔ایس کرکے کینیڈا چلے گئے تھے اور وہاں کسی یونیورسٹی

میں پڑھاتے ہیں۔ وہ ضلع باریسال کے ایک غریب گھرانے سے تھے "ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گاؤں کے ساہوکار نے میری مدد کی تھی جس کے لیے میں احسان مند ہوں لیکن ضرورت پڑنے پر اُس کے گھر جاتا تو وہ مجھے قریب نہ پھٹکنے دیتا، دیکھ کے کتّے کی طرح دھتکار دیتا، وہ ڈرتا تھا کہ اُس کے گھر پہ میرا سایہ نہ پڑ جائے۔"

"تعجب ہے، پاکستان بننے کے بعد بھی؟"

"آزادی کے بعد کی ہی بات کر رہا ہوں!"

رُوح الامین کہہ رہے تھے کہ اس دفعہ وطن آ کے انہیں مایوسی ہوئی، چٹاگانگ آتے ہوئے لوگوں نے بار بار زنجیر کھینچ کے گاڑی روکی، ایسی جگہوں پر بھی گاڑی ٹھہرائی جہاں اسٹیشن تک نہ تھا۔ چٹاگانگ پہنچتے پہنچتے میل ٹرین تین گھنٹے لیٹ ہو گئی "لوگ نہیں سمجھتے کہ قانون شکنی سب کے لیے نقصان دہ ہے۔ ایک اور رُجحان یہ ہے کہ مسائل کا حل تلاش کرنے کی بجائے دوسروں پہ دوش دھرتے ہیں، اس مرتبہ مجھے یہ دیکھ کر تشویش ہوئی کہ ہر جگہ بچے ہی بچے ہیں۔ بڑے شہروں کے قرب و جوار میں کوئی جگہ خالی نہیں رہی، کچّی بستیوں میں صاف پانی اور پختہ بدرو کی سہولت تک میسّر نہیں۔ قانون کا احترام اور آبادی کی روک تھام نہ کرنا تباہی کو دعوت دیتا ہے۔" لیکن مشرقی پاکستان میں کتنے لوگ رُوح الامین کے ہم خیال ہونگے؟

سڑک کے کنارے ایک کسان چاول کا کھیت سینچ رہا تھا۔ . . . .

. . . . جفاکش چاشی پہروں دلدل میں کھڑا رہ کر دھان کی فصل تیار کرتا ہے، پانی میں غوطہ لگا کر پٹ سن کاٹتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے سُپاری کے لانبے درخت پر چڑھ جاتا ہے۔ پختہ سُپاری نیچے پھینک کر سُبک تنے کو جُھلاتا ہے اور جان جوکھوں میں ڈال کر دوسرے درخت پر پھلانگ جاتا ہے، پھر تیسرے اور چوتھے پر . . . . . .

یہی چاشی رات کا اُبلا چاول پانی میں بھگو کے رکھ دے گا اور صبح اچار کے ساتھ

کھائے گا ۔

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

لیکن حلاوت کہاں تھی ؟ میں نے بچّوں کو مچھلی کی بے سُود تلاش میں گدلا پانی کھنگالتے دیکھا، اسی تالاب سے پانی پیتے دیکھا جہاں ڈھور ڈنگر تیرتے تھے، صبر کے ساتھ طویل بیماری کاٹتے دیکھا۔

اک بخیہ اُدھیڑا ایک سیا یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

ٹوکو میاں سے میری ہمسائیگی ایک برس رہی، اُس کی آبائی زمین نہیں تھی لیکن جوانی میں اُس کے بازوؤں میں طاقت تھی، وہ دو مزدوروں جتنا کام کر سکتا تھا۔ فصل کی کٹائی کے وقت وہ ایک "کانی" تنہا کاٹ لیتا، پس انداختہ سے اُس نے آدھ ایکڑ زمین خریدی، چھوٹا سا گھر بنایا اور دو چار پھل دار درخت لگائے، اُسے آشا تھی کہ بیٹا جوان ہو کر کمائے گا اور اُسے سُکھ ملیگا، اسّی سالہ ٹوکو میاں ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے اور چلنے پھرنے سے معذور، لڑکے کی شادی ہو گئی، اُس کے چار بچّے ہیں، وہ کس کس کا پیٹ بھرے۔ غروب سے پہلے پچھمی آکاش پہ آتشیں لاوا دُور تک پھیل جاتا ہے

نغمۂ شام کو خاموشیٔ شام آئینہ

اور اُس خامشی میں چپوؤں سے کشتی کھینے کی گھُٹی گھُٹی صدا آتی ہے تو ٹوکو میاں سوچتا ہے آفتابِ عمر لبِ بام آ پہنچا، اب روٹی کی فکر نہیں ہونی چاہیئے تھی، دس پندرہ برس اِدھر یہ تنگی نہ تھی، چاول، مچھلی اور پھل عام تھا لیکن وہ زمانہ خواب و خیال ہو گیا . . . .

سونار دیش! تیرے دریاؤں میں پگھلا سونا ہے، تیری دھرتی زمرّد اُگلتی ہے

ڈیوک آف ایڈنبرا نے سچ کہا تھا ۔ THIS IS A LANDSCAPE IN WATER COLOURS پھر انسان دکھی کیوں ہے؟ کون اس درد کا مداوا

ڈھونڈے گا جو صدیوں جینا کا مقدّر رہا یا حسرت و واماندگی کی چکّی چلتی رہے گی، وقت گزرنے کے ساتھ تشنہ مسائل بھیانک صورت اختیار کرلیں گے۔

ہوا کے مہربان جھونکو! اُپاری کے درختوں کو جھلاتے رہو،
ناریل کے مغرور درختو! دریا کی لہروں میں اپنا عکس دیکھتے رہو،
ذخّار دریاؤ! دھیرے دھیرے بہتے رہو۔
تمہاری گہرائیاں اتھاہ ہیں، غمِ انسان اتھاہ ہے، دریا کا بہاؤ امر ہے، غم امر ہے، غم زندگی ہے۔

۱۹۶۲ء

غروبِ عظمت

اے صبا نکہتے از کوئے فلانے بمن آر
زار و بیمارِ غمم راحتِ جانے بمن آر
(حافظ)

چراغ کے مُدام ایک جگہ جلنے سے دیوار پر دھوئیں کی دبیز سیاہ محراب بن گئی تھی۔ ڈیوڑھی کا بھاری کواڑ کھلنے سے دیئے کی لَو جھلملاتی اور ایک دھندلا ہیولیٰ دیوار پہ کھچ جاتا، یہ چالیس برس اِدھر کی بات ہے۔ ستلج کے کنارے آباد اس پرانے شہر میں ابھی بجلی نہیں آئی تھی، گھر میں دولت کی ریل پیل تو نہ تھی، کوئی کارخانہ یا بڑی زمینداری بھی نہ تھی، لیکن یہ خوش حال گھرانہ تھا کسی چیز کی کمی نہ تھی، صبح صبح فقیر صدا لگاتے "دُودھ پوت کی خیر" بزرگوں کے آبائی مکان کا اوّلین خاکہ میرے ذہن پہ مرتسم ہے، قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ "دودھ پوت" ۱۹۴۷ء کے سَیل میں بہہ جائیں اور اس خاندان کے پچیس افراد سرہند ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر شہید ہوں۔

میرے بچپن کے دو سال وہاں گزرے، شہر میں لوگ جھگڑا چکانے کے لیے میرے ددھیال کو ثالث مانتے، الیکشن صوبائی اسمبلی کا ہو یا مرکزی اسمبلی کا، اس حلقے کی نشست کے لیے اُمیدوار اس خاندان کی تائید حاصل کرنے میں پہل کرتے

فلک مزدورِ ایمائی تو باشد
نواز دہر کرارائے تو باشد
(نظیری)

سارا علاقہ اشارے کا منتظر رہتا جس سے وعدہ ہو جاتا مطمئن ہو کے لوٹتا کہ شہر اور نواحی علاقے کے ووٹ محفوظ ہیں ۔ یہ علاقہ جو اکالیوں کا گڑھ تھا، جہاں غیر مسلم اکثریت میں تھے ۔ یہاں نانا[^1] شہید قریب بیس برس میونسپل کمیٹی کے وائس پریذیڈنٹ رہے، جب دیہات ملک پور میں عیدِ قربان کے موقع پر سکھوں نے فساد برپا کیا اور اسلام کے نشے میں سرشار سادہ دل مسلمانوں نے ڈٹ کے مقابلہ کیا تو ہائی کورٹ تک مقدموں کی پیروی اسی خاندان نے کی، ہمیشہ یہ فکر رہتی کہ دینی حمیّت پہ آنچ نہ آنے پائے، یکسوں اور بیواؤں کی دیکھ بھال، طالب علموں کی فی سبیل اللہ امداد ان لوگوں کا شعار تھا، والد محترم کی وفات پر "م ش" نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا "اِن کا خاندان مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی دینی غیرت کا نشان تھا ۔"

داداجان کی پُرنور شخصیت آج بھی نظروں کے سامنے ہے، سر پہ خام ریشم کا صافہ، کُندن کی طرح دمکتا ہوا رنگ، سفید لانبی ڈاڑھی، نیلگوں آنکھیں، اکہرا بدن اور دراز قد ہونے کی وجہ سے کمر میں قدرے خمیدگی آچلی تھی ۔ داداجان جنھوں نے وفات سے پندرہ سولہ برس پیشتر علائقِ دنیا سے قطع تعلق کر لیا تھا اور اُس سرائے میں اُٹھ آئے تھے جو انھوں نے مسافروں کے لیے وقف کر دی تھی، اپنے حجرے کے عین سامنے انھوں نے ایک خوبصورت کشادہ مسجد تعمیر کروائی تھی، فجر کی نماز کے بعد وہاں جھوم جھوم کے قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ع

ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

---

[^1]: شیخ رحمت الٰہی مرحوم و مغفور

وسیع المشرب ایسے کہ پیش امام کبھی اہل حدیث مسلک کے ہوتے کبھی دیوبند کے وہ فرق روا نہ رکھتے تھے۔

داداجان اور مسافروں کا کھانا گھر سے آتا، عشاء کی نماز کے بعد انبالہ سے آخری گاڑی آتی، مسافروں کے لیے کھانا کم ہوجاتا تو اپنا کھانا دے دیتے خود دُودھ کا گلاس پی کے سو رہتے، مولوی قادر بخش چند برس اس مسجد کے پیش امام رہے، ان کا کہنا تھا کہ مَیں اصرار کرتا کہ آپ اپنی صحت کا خیال کریں کھانا گھر سے منگوالیں تو جواب دیتے، نہیں بیبیاں آرام کر رہی ہوں گی، انہیں تکلیف ہوگی، اس بات کو ایک زمانہ گزر چکا تھا، لیکن جب کبھی مولوی صاحب سے داداجان کا ذکر آتا تو وہ آبدیدہ ہوجاتے۔

داداجان نمود و نمائش سے کوسوں دُور تھے۔ دو تین دفعہ ایسا ہوا کہ چند کپڑے سنبھالے اور کسی کو بتلائے بغیر حج کو چلے گئے۔ بیٹوں کو جب پتہ چلتا فوراً کراچی کا رُخ کرتے تاکہ حاجی کیمپ میں ہی زیارت ہوجائے۔

اِس صدی کے آغاز میں روپڑ میں ہائی اسکول نہ تھا، کھرڑ کا قصبہ چند میل کے فاصلے پر تھا۔ آباجانؒ وہاں مشنری اسکول میں داخل کروا دیئے گئے۔ ہیڈ ماسٹر ایک انگریز پادری تھا، اُس نے بھانپ لیا کہ جوہرِ قابل ہے، اُسی نے گھر والوں کو آمادہ کیا کہ انہیں میٹرک سے پہلے انگلستان بھیج دیا جائے، داداجان برغبت رضامند نہ ہوتے تھے مگر تایا شہید کی محبت آڑے آئی۔ عنفوانِ شباب تھا کہ انگلستان بھیج دیئے گئے۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۵ء تک کا زمانہ وہاں گزارا، جنگِ عظیم سے پہلے کا یورپ، عیش و نعم کا کونسا در ہوگا جو وا نہ ہوگا لیکن پاکستان بننے کے بعد جب مولانا صدرالدینؒ سے میرا تعارف ہوا تو فرمانے لگے

ل قبلہ ام شیخ محبوب الٰہی

ل مولانا برسوں دو دکنگ مسجد میں پیش امام رہے۔

"میں نے محبوب الٰہی جیسا صالح نوجوان آج تک نہیں دیکھا، انہوں نے انگلستان میں بھی صوم و صلوٰۃ کی پابندی کی۔" باتوں میں ایک دفعہ والد مرحوم نے یہ ذکر ضرور کیا تھا کہ "لینڈ لیڈی پھل، دودھ اور کوئی کھانے کی چیز میرے کمرے میں رکھ دیتی تھی جو میں سحری کے وقت کھا لیتا تھا۔" انہیں اس بات پہ ناز تھا کہ مسلسل اُنچاس برس اُن کا کوئی روزہ قضا نہ ہوا تھا، آخری عمر میں بیماری کے باعث روزہ نہ رکھ سکنے کا ملال بھی تھا۔ تزکیۂ نفس کے باوصف ان کے مختلف النوع مشغلے تھے، وہ برسوں شکار کھیلتے رہے۔ ایک اچھی کلب کا ممبر بننے کا شوق اور ٹینس سے شغف انگلستان سے شروع ہوا اور مدتوں رہا، ایک دفعہ ایک عمدہ سیاہ سُوٹ بکس میں سے نکال رہے تھے فرمانے لگے "یہ ان دنوں انگلستان میں تھیٹر جاتے وقت پہنتے تھے۔" یہ ضرور ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک جائز اور ناجائز کے درمیان تقویٰ کی دیوار حائل تھی، وہ اللہ کی رضا میں مست تھے اُس کی نعمتوں سے بھرپور طور پر لُطف اندوز ہوتے لیکن انہیں اس سے قطعاً دلچسپی نہ تھی کہ پسِ دیوار کیا ہنگامے ہیں۔

۱۹۲۷ء کا فیروزپور مجھے خواب کی طرح یاد ہے، میری عمر سات آٹھ برس ہوگی۔ وسیع و عریض کوٹھی جس میں پھلدار درختوں کی بہتات تھی، چند کھیتوں میں جانوروں کے لیے چارا بو دیا جاتا، چند قطعے سبزی کے لیے مخصوص تھے، گائے بھینس گھوڑے فٹن بگھی موٹر کار مرغیوں کے ڈربے اور کیا کچھ، ابّا جان سپرنٹنڈنٹ گرے کنال تھے، ستلج ویلی پراجیکٹ کے انعقاد سے پہلے اس علاقے کو دس غیر مستقل نہریں سیراب کرتی تھیں، وہ کبھی کار اور بگھی پہ لیکن عموماً گھوڑے پہ دورہ کرتے، بڑے اہتمام کے ساتھ سفر کرتے۔ قیام و طعام کا سامان اور ہر طرح کا زادِ سفر ساتھ ہوتا ٹفن ٹوکری، راشن، صُراحی .... وہ گھوڑ سواری میں انتھک مشہور تھے۔ اُنہوں نے بتلایا تھا کہ ایک دفعہ میں روزے سے تھا، آٹھ ساڑھے آٹھ بجے گھوڑے پر سوار ہوا اور ظہر کی نماز کے لیے اڑھائی

بجے اترا" ہمرہان سست عناصر" کہتے تھے" شیخ صاحب کی کمر میں سیسہ بھرا ہوا ہے جو نکلتے نہیں۔" اس روز ان کا کھانا ایک بڑے زمیندار نے تیار کیا تھا لیکن اُس کا جھگڑا چند لوگوں سے تھا جو مقابلتاً غریب تھے، اباجان نے خوانِ نعمت قبول نہ کیا اور کہلوا بھیجا" دوسرے فریق کو گمان ہوگا کہ میں اُن کے ساتھ انصاف نہ کرسکوں گا۔" اباجان نے کہا" اس پُرتکلف دعوت کی بجائے میں نے توریا کی سبزی کو ترجیح دی، تاروں بھری رات تھی۔ جگراؤں کی ٹھنڈی ریت تاحدِ نظر پھیلی تھی، دن بھر کا تھکا ہوا تھا، بستر پر لیٹتے ہی نیند آگئی۔"

یہ ابا کا عہدِ شباب تھا، لانبا قد، سُرخ سفید رنگ، دہکتا ہوا چہرہ، متناسب اعضاء، گھوڑے کی مسلسل سواری کی وجہ سے چاک و چوبند، ابا کی طبیعت میں اُن دنوں بہت جلال تھا، یہ ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے کہ ایک انگریز لیفٹیننٹ نے اُن کو فرسٹ کلاس میں سفر کرنے پر ٹوکا کیوں کہ وہاں وہ اور اس کی بیوی پہلے سے بیٹھے تھے تو بید کی چھڑی سے جو ہمیشہ ہاتھ میں رہتی تھی اُسے اس بُری طرح پیٹا کہ اُس نے سفر نہ کرنے میں خیریت سمجھی اور فیروزپور ریلوے اسٹیشن پر اپنا سامان گاڑی سے اُتروا لیا، لیکن اپنوں کے ساتھ شفقت و مروّت کا یہ عالم تھا کہ ایک اجنبی اسسٹنٹ انجنیئر کا سامان اس کی عدم موجودگی میں ریسٹ ہاؤس سے اُٹھوا لائے۔ یہ نوجوان فیروزپور میں نووارد تھا اور یہ اس کی پہلی پوسٹنگ تھی۔ کوئی پینتیس برس بعد خان اعظم خان نے جو ۱۹۶۰ء میں مشرقی پاکستان میں واپڈا کے سربراہ تھے میری موجودگی میں یہ قصّہ ایک دوست کو سنایا:

"میں اس کے ابا کے ہاں چھ ماہ مہمان رہا، تعجب کی بات ہے کہ ہم پہلے کبھی نہ ملے تھے، نہ ہی ہمارے بزرگوں کی باہم شناسائی تھی۔"

ابا کی ملازمت کا آغاز بحیثیت اسسٹنٹ انجنیئر گلبرگہ ہوا، قیامِ دکن کی یادگار ——

قبلہ مرحوم کے نام مہاراجہ سرکشن پرشاد کے خطوط نہ صرف خطاطی کا نادر نمونہ تھے بلکہ مضمون کے لحاظ سے بھی ان میں ایک انوکھا پن تھا، یہ خطوط ہمارے پاس محفوظ تھے لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں پس و پیش ہو گئے۔ ہر خط کا القاب کچھ ایسا تھا "محبوب شاد"، "شاد نواز" اکثر خطوط میں قبلہ کے اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کی طرف رجوع کے حوالے تھے، بالخصوص گلبرگہ کے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے والہانہ عشق کا تذکرہ، والد مرحوم کی عمر اُس وقت پچّیس برس کی ہوگی، نوعمری اور عہدہ کے پیشِ نظر صدرِ اعظم سے ذاتی مراسم اُن کی غیر معمولی شخصیّت سے ہی منسوب کیے جا سکتے ہیں۔ وطن سے دُوری کے باعث جب پنجاب میں سروس کرنے کا خیال پیدا ہوا تو مہاراجہ سرکشن پرشاد نے ایک تعارفی خط اس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے نام دیا۔ والد مرحوم کا کہنا تھا کہ لیفٹیننٹ گورنر اس وقت شملہ میں مقیم تھے، مَیں وہ خط دے کر چلا آیا، رات گئے تک گورنمنٹ ہاؤس کے خدّام مجھے ڈھونڈتے رہے کہ وہ شخص کہاں ہے جو مہاراجہ سرکشن پرشاد کا خط لایا تھا۔

ابّا سرکاری ملازمت میں تھے لیکن غیر منقسم پنجاب کا کوئی ہی سربرآوردہ خاندان یا عظیم شخصیّت ہوگی جس سے اُن کے ذاتی مراسم نہ ہوں۔ اس کے باوجود بے حد غیور اور حساس تھے۔ خودداری کی نگہبانی ہر شے پر مقدّم تھی۔

ایک بڑے زمیندار ان کے پرانے شناسا تھے، ۱۹۳۰ء میں وہ متعدد دفعہ ہمارے مہمان ہوئے، مجھے ان کا لٹھے کا تہمد اور سفید ململ کا صافہ یاد ہے، یونینسٹ پارٹی کی تشکیل پر انہیں بڑا عروج نصیب ہوا، والد مرحوم نے دو ایک مرتبہ کوئی کام کہا لیکن انہوں نے توجّہ نہ دی، والد مرحوم نے قطع تعلق کی حد تک خاموشی اختیار کر لی۔ چند برس بعد جب یونینسٹ پارٹی کی اسپیشل ٹرین لائل پور اسٹیشن پر پہنچی تو وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں کی پیشوائی کے لیے حکامِ ضلع پلیٹ فارم پر موجود تھے، انہی صاحب نے نیم سنجیدگی کے ساتھ جھک کر سلام کیا، والد مرحوم نے طنزاً کہا "رعایا کا فرض ہے کہ

اپنے حاکم کو جھک کر سلام کرے!" ـــــ اور انہیں نظر انداز کر کے کسی اور صاحب سے بات کرنے لگے۔

ہم نے بچپن سے دیکھا کہ والد مرحوم کے پاس ممتاز شخصیتوں کا آنا جانا ہے۔ ایسے لوگ ملنے کے لیے آجاتے یا کھانے یا چائے پر مدعو ہوتے، ان میں سے چند ہمارے ہاں قیام بھی کرتے، بسا اوقات دنیاوی لحاظ سے وہ رُتبے میں بلند ہوتے لیکن تعلقات ہمیشہ دوستانہ رہے۔ ہم نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ کسی تعلق میں تملّق یا خوشامد کا پہلو نکلتا ہو، وہ ہر کہہ ومہہ کے ساتھ ایک جیسا سلوک روا رکھتے، چھوٹا ہو یا بڑا مروّت اور اخلاق میں کمی نہ آتی۔ ایسے روزمرّہ کے مشاہدات کا ہم نے خاص اثر قبول کیا، یوں بھی ایسا ردِّ عمل ایک قدرتی چیز تھی، ایک لحاظ سے یہ ہوس سینے میں مر گئی کہ بڑے لوگوں سے راہ و رسم بڑھانا بجائے خود ایک طرۂ امتیاز ہے۔

این۔ ڈی۔ یوسف صاحب[1] نے تیس برس پہلے کا ذکر چھیڑ دیا۔ کہنے لگے مَیں ۱۹۳۶ء میں کیمبرج سے ایم۔ ایس۔ سی کر کے لَوٹا تھا، اُن دنوں ملازمت کا ملنا کارِ دارد تھا، شیخ صاحب نے وزیر تعلیم کے پاس سفارش کی چند ماہ بعد ایمرسن کالج ملتان میں لیکچرار کی جگہ خالی ہوئی۔ کسی وجہ سے وہ جگہ کسی اور صاحب کو مل گئی۔ مَیں نے شیخ صاحب سے ذکر کیا تو وہ اپنے ساتھ لاہور لے گئے اُن دنوں اسمبلی کا سیشن ہو رہا تھا اور وزیر موصوف اسمبلی بلڈنگ میں اپنے کمرے میں تھے۔ شیخ صاحب نے گلہ کرتے ہوئے وزیر صاحب کا کان اس انداز سے اینٹھ لیا کہ کان سُرخ ہو گیا اور چہرہ بھی تمتما اُٹھا۔ مجھے یہ ایزاد کر دینا چاہیئے کہ صاحبِ موصوف کے ساتھ ہمارے خاندان کے دیرینہ مراسم تھے، بلکہ اسمبلی کی نشست کے لیے جس حلقہ سے اُمیدوار ہوتے اس میں ہمارا آبائی وطن شامل تھا۔

---

[1] ڈین زراعتی یونیورسٹی لائل پور

ابا کی وفات پر ایک دوست نے کہا تھا: "پاکستان بننے کے بعد تو سبھی مسلمان ہو گئے، آزادی سے پہلے مسلمان بن کے دکھانا کسی کسی کا کام تھا"۔ یہ صحیح ہے کہ انگریز حاکم اور ہندوؤں اور سکھوں کی موجودگی میں مسلمانوں کو ان کا حق دلوانا اور ان کے حقوق کے لیے پامردی سے سینہ سپر ہونا بڑی جرأت کا کام تھا تاہم متعدد ہندو اور سکھ ان کے مخلص ترین دوستوں میں تھے۔ آنکھوں کے مشہور سرجن موگا والے رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس سے ۱۹۲۴ء میں دوستانہ مراسم قائم ہوئے اور آخری دم تک رہے، ۱۹۲۸ء میں والد مرحوم کی تبدیلی لائل پور ہو گئی تو ہر پندرواڑھے اردو میں لکھا ہوا خیریت کا کارڈ باقاعدگی سے آتا:

"میرے پیارے شیخ جی ۔۔۔۔۔"

قیام پاکستان پر جب ڈاکٹر متھرا داس اپنی بہت سی جائداد یہاں چھوڑ کے دلّی چلے گئے تو ان کے خاندان کے بیس پچیس افراد کو سر چھپانے کے لیے کناٹ سرکس میں دو کمرے ملے اور کچھ عرصہ حالات ناسازگار رہے، اس زمانے میں جب والد مرحوم اپنے دوست کی تکلیف کا ذکر کرتے تو اُن کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔

سر جوگندر سنگھ کے ساتھ دوستی کا یہ عالم تھا کہ کسی وقت بھی ان کے پاس چلے جاتے۔ سردار صاحب بیحد تلطف کے ساتھ پیش آتے اور خاطر مدارات کرتے، سردار صاحب والد مرحوم کے محکمے کے وزیر بھی ہو گئے لیکن اس رویّہ میں فرق نہ آیا۔ ابا کہتے تھے سردار صاحب مجھے دیکھ کر مُسکراتے اور کہتے "شیخ صاحب نوٹ لے آئے ہو؟" میں جواب دیتا "جی ہاں لے آیا ہوں" اور جیب سے وہ پرزہ نکال لیتا جس پر بالعموم لوگوں کے کام لکھے ہوتے، سردار صاحب کہتے "شیخ صاحب میں تو سکھوں کا وزیر ہوں آپ کسی مسلمان وزیر کے پاس جائیں"۔

"جی نہیں، یہ کام تو آپ ہی سے کروانے ہیں"۔

جس سے ٹھن گئی ٹھن گئی ـــــــ چودھری سر چھوٹو رام وزیر زراعت ہوئے تو

ایک عشائیہ پر جانے چودھری صاحب کو کیا سوجھی، کہنے لگے "مغلوں کے زمانے میں ہم ہندو جاٹوں پر بہت مظالم ہوئے"۔ ابّا فوراً بولے "جی ہاں ضرور ہوئے ہوں گے، تبھی دِلّی کے گرد و نواح میں مسلمانوں کی آبادی آٹھ فی صد ہے!" ابّا نے بتلایا تھا کہ میرا جواب سُن کے چودھری صاحب مارے غصّے کے پیچ و تاب کھانے لگے۔ پھر کبھی ان کی صورت نہ دیکھی۔

ابّا اُن ہستیوں میں سے تھے جنہیں اس بات کا یقین تھا کہ پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو کے رہے گا۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن کے دوران اس وقت کے وزیرِ اعلیٰ نے تنبیہہ کی کہ اگر آپ نے الیکشن میں مسلم لیگ کی حمایت کی تو سرکار آپ کی پنشن ضبط کر لے گی لیکن ابّا ٹس سے مس نہ ہوئے اور نتیجے سے بے نیاز ہو کر کھلے بندوں لیگ کی حمایت کی، جب اس کی پاداش میں پنشن کا چوتھا حصّہ کاٹ لیا گیا تو اُن کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ پاکستان بننے کے بعد اس کی بازیابی کی تحریک کریں۔ ابّا کے انتقال پر اُن دِلوں کا ذکر کرتے ہوئے نذیر رضوی[1] صاحب نے لکھا تھا:

> "مجھے ان سے پہلی ملاقات یاد آ رہی ہے، مولانا ابوالکلام آزاد لاہور آئے ہوئے تھے تاکہ پنجاب میں مسلم لیگ کی وزارت نہ بن سکے، ہم مسلم لیگ کے چند دیوانے خبروں کے لیے بیقراری میں انبالے سے لاہور آ بیٹھے، چودھری محمد حسین لدھیانوی مرحوم کے پاس قبلہ شیخ صاحب کی زیارت ہوئی اور بار بار پہروں ملاقات رہی، اوّل اوّل اُن کی باخبری نے ہمیں اُن کا مشتاق بنایا اور پھر مجھے تو اُن کی صاف ستھری دلیر اور بارونق شخصیت، ان کی اسلام دوستی اور قائدِ اعظم سے اُن کی محبّت نے فوراً ہی موہ لیا، جب یونینسٹ نے کانگریس سے مل کر وزارت بنالی تو سخت مایوسی چھائی لیکن شیخ صاحب لوگوں کی افسردگی

---

[1] سیّد غلام بھیک نیرنگ کے بھتیجے ہیں۔

کا مذاق اُڑاتے رہے، مَیں لوٹا تو خوش تھا کہ ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں
جو ستون کی طرح ہیں اور مجھے اس پر فخر تھا کہ وہ میرے وطن میں پیدا
ہوئے۔"

یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ملّتِ اسلامیہ کے حقوق کی نگہداشت انہیں سونپ رکھی تھی، زندگی بھر وہ ملّت کے ہر کام میں پیش پیش رہے، انجمن اسلامیہ فیروز پور سے ان کی وابستگی تو میرے ہوش سے پہلے کی بات ہے۔ وہ کئی سال انجمن حمایتِ اسلام لاہور اور انجمن ترقیٔ تعلیم مسلمانانِ ہند امرتسر کے سرگرم ممبر رہے۔ انجمن اسلامیہ لائل پور کی سربراہی انہیں ۱۹۳۵ء میں تفویض ہوئی اور دمِ آخر تک رہی، اس شہر کے تعلیمی اور سماجی اداروں پر اُن کی بے لوث خدمت کی مُہر ثبت ہے، قومی کاموں میں ان کا انہماک دیدنی ہوتا۔ یتیم خانے کی زمین کے لیے ڈپٹی کمشنر میکڈانلڈ سے مل رہے ہیں، اب عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ قبرستان کی توسیع کے لیے کوشاں ہیں۔ جامع مسجد کے پہلے لاؤڈ سپیکر کے لیے عید کے موقع پر سفید چادر کا ایک کونا تھامے نمازیوں سے چندہ مانگ رہے، دونیّوں، چونیوں، اٹھنّیوں کی بارش ہو رہی ہے .... پاکستان بننے سے کچھ عرصہ پیشتر انہوں نے اسلامیہ کالج لائل پور کی بنیاد رکھی۔ اسٹاف کا انتخاب خود کیا اور اس احسن طریقہ سے چلایا کہ مغربی پاکستان میں محمود الرحمٰن کمشن نے جن دو پرائیوٹ تعلیمی اداروں کے حُسنِ انتظام کی تعریف کی اُن میں سے ایک یہی ادارہ تھا۔ اتفاق سے اُن دنوں مَیں حکومت مغربی پاکستان میں سیکرٹری محکمہ تعلیمات تھا، چونکہ رپورٹ کے مطابق سرکاری کالج بالعموم قابلِ تعریف نہیں سمجھے گئے تھے، رپورٹ پڑھتے ہی والد مرحوم کے دیرینہ دوست میاں محمدّ افضل حسین نے مجھے فون کرنے میں پہل کی:

"دیکھا ہمارا بھائی جیت گیا، بھتیجا ہار گیا!"

سالہا سال کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے انجمن کے متعدد اداروں سے متعلق

کسی سب کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت نہ کی ہو جس کے وہ خود صدر تھے، یتیم خانہ کمیٹی، قبرستان کمیٹی، ہائی اسکول کمیٹی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لائل پور کی گرمی، مئی کا مہینہ، اُس وقت اُن کی عمر ۶۵ برس کی ہوگی، سہ پہر کے ساڑھے چار بجے وہ اسکول کمیٹی کی میٹنگ کے لیے پیدل روانہ ہو چکے تھے، ان سب کاموں کو وہ بے حد اہمیت دیتے، یہی حال پنجاب یونیورسٹی سینیٹ اور سنڈیکیٹ، زراعتی یونیورسٹی سنڈیکیٹ اور اُن سے متعلق سب کمیٹیوں کا تھا۔ وہ فراست، اور سیادت کا حسین امتزاج تھے، جو ادارہ رفاہِ عامہ کے کام سے منسلک ہوتا وہ وہاں موجود ہوتے میٹنگ کی تیاری میں ایجنڈا کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنا پھر بحث میں بھر پور حصّہ لینا اور اپنا نقطۂ نظر منوانا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے ۔ ایک دفعہ مجھ سے فرمانے لگے "جن لوگوں کے کام اٹک جاتے ہیں وہ کس کے پاس جائیں ؟"

وہ برسوں صوبائی فروٹ ڈیولپمنٹ بورڈ اور سنٹرل کواپریٹو اسٹور کے نائب صدر رہے، ریجنل ٹرانسپورٹ اتھارٹی، ریلوے ایڈوائزری کمیٹی، امپرومنٹ ٹرسٹ، ڈسٹرکٹ بورڈ میونسپل کمیٹی لائل پور کی صدارت پھر ممبری، یہ سب اُس مردِ خدا کی جولان گاہ تھے ۔

علاّمہ اقبال کی ذات سے انہیں بے حد عقیدت تھی، ابا کی نظر میں وہ مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے علمبردار تھے۔ پھر ابا عمر بھر قرآنِ کریم کی تلاوت پابندی کے ساتھ کرتے رہے انہیں اس شخص سے محبّت کیونکر نہ ہوتی جس پہ اس کا اپنا شعر صادق آتا تھا ؎

نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش
جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

وہ اس کمیٹی کے رُکن تھے جس کی زیرِ نگرانی مزارِ اقبال کی تعمیر ہوئی بلکہ تعمیر کے فنّی پہلوؤں کی نگہداشت انہوں نے کی تھی، وہ ۱۹۲۸ء میں مجلسِ مرکزیہ اقبال کی ورکنگ کمیٹی کے رکن مقرر ہوئے اور آخر دم تک رہے ۔

ابّا نے ایسی بھرپور زندگی بسر کی کہ یقین نہیں آتا کہ ان کی زندگی کا جام لبریز ہو چکا۔ صاحب آبِ کوثر شیخ محمدؐ اکرام تعزیت کے لیے آئے تو فرمانے لگے کہ اگر آپ اس قسم کی تاریخی دستاویز مرتب کر سکیں جس سے پتہ چل سکے کہ شیخ صاحب نے کس کس جگہ اور کس طور قوم اور ملّت کی خدمت کی تو موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے سبق ہوگا کہ انسان ایک زندگی میں کیا کچھ کر سکتا ہے۔

صوم و صلوٰۃ کی سختی سے پابندی کے باوجود "زاہدِ خشک" وہ کبھی نہ تھے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ انہوں نے بھرپور زندگی بسر کی، جوانی میں شکار اور گھوڑے کی سواری، دوستوں کی محفلیں .... اُن کی جولانیٔ طبع محفل کو گرما دیتی، دوستوں میں وہ ظرافت کی چاشنی اور حاضر جوابی کے لیے مشہور تھے، اُن کے احباب کا دائرہ بہت وسیع تھا، انہیں اس بات پہ فخر تھا کہ ایسے خاندان بھی تھے جہاں انھوں نے تین پُشتوں تک تعلقات نبھائے۔

بے شک وہ عظیم باپ تھے لیکن یوں بھی نہ تھا کہ اُن کے حضور رُعب سے زبان گنگ ہو جائے، جوانی میں ان کی طبیعت میں سختی ضرور تھی، وہ بچّوں اور ملازموں کو سخت سُست بھی کہہ دیتے لیکن جوں جوں عمر گزرتی گئی جمالی پہلو غالب آتا گیا حتیٰ کہ وہ ہمارے دوست بن گئے۔ وہ اچھی گفتگو سے خوش ہوتے۔ ہمیں باتوں پہ اُکساتے، ہم میں سے کوئی فقرہ چُست کر دیتا تو وہ محظوظ ہوتے اور فیاضی سے داد دیتے۔

کبھی عمرِ گزشتہ صدائے بازگشت کی طرح لوٹ آتی اور وہ بھُولی بسری باتوں میں کھو جاتے، سرگزشت کے اوراق "وہ مزے مزے کی حکائتیں" بیتی کہانیاں تجسیم کا لبادہ اوڑھ لیتیں، ماضی کا فانوس حق اور صداقت کی لَو سے جگمگا اُٹھتا۔ لطیفے، پھُلجھڑیاں، پُرلطف باتوں کا سلسلہ، رات آنکھوں میں کٹ جاتی، ہم لوگ گھنٹوں باتیں کیا کرتے لیکن جی نہ بھرتا تھا

زمانِ خوشدلی دریاب دریاب
کہ دائم در صدف گوہر نباشد
(حافظؔ)

رمضان میں وہ ایک مرتبہ لاہور دورے پر آئے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد مجلس جم گئی، اُدھر سحری کے لیے نوبت بجی اِدھر ہم اُٹھے۔ رات کا ایک ڈیڑھ بج جانا کوئی بات ہی نہ تھی، صحبت کا وہ خمار آج تک نہیں اُترا ؏

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنجِ خمارِ ما

لائل پور۔ جڑانوالہ۔ لاہور روڈ۔ ؏

پوشیدہ تیری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں

جب ہم بھائی ابا کے شریکِ سفر ہوتے تو کار کی پچھلی سیٹ سے کھیتوں کے درمیان کچے گھروندوں کو دیکھتے جہاں بھی نماز کا وقت ہو جاتا لبِ سڑک جانماز بچھ جاتی، نماز ادا کی جاتی پھر کار میں بیٹھتے ہی دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود۔ جب سڑک دو بل کھا چکتی تو ہم جانچ لیتے کہ آدھا راستہ طے ہو چکا۔ اب شرق پور دور نہیں، وہاں میاں شیر محمدؒ صاحب کے مزار پہ فاتحہ کہتے پھر آگے بڑھتے، سردی ہو یا گرمی، بارش ہو یا طوفان اس معمول میں فرق نہ آتا، ایک دفعہ ایک سینئر افسر نے لاہور آنے کے لیے رفاقت کی خواہش کی۔ ابا نے کہا چلے چلو لیکن شرق پور میں فاتحہ خوانی میرا معمول ہے، کوئی آدھ گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ براؤنلی صاحب نے سوچا ہوگا یہ سودا مہنگا پڑے گا اور ریل سے چلے گئے۔

بزرگانِ دین سے عقیدت قبلہ مرحوم کو روزِ ازل سے ودیعت ہوئی تھی۔ آزادی سے قبل جب کبھی سرہند شریف سے گزر ہوتا حضرت مجدد الف ثانیؒ کی درگاہ پہ حاضر ہوتے، بالخصوص عرس کے موقع پر ہمیشہ حاضری دی، پاکستان بنتے کے بعد بھی سالارِ قافلہ

کی حیثیت سے دو مرتبہ وہاں گئے، وفات کے بعد ایک قریبی دوست نے مجھے بتلایا تھا کہ روضۂ مبارک میں بجلی لگوانے کا کام قبلہ نے اپنے ذمے لے لیا تھا اور اپنی نگرانی میں مکمل کروایا تھا، ان کا خیال تھا کہ قبلہ مرحوم کو امام ربّانی حضرت مجدّد الف ثانی کے توسط سے دینی و دنیوی فیوض حاصل ہوئے، اسی طرح جب لاہور آتے جمعرات کو مغرب کی نماز داتا صاحب کے مزار پر ادا کرتے، برِصغیر میں شاید ہی کوئی بڑی درگاہ ہو گی جہاں انہوں نے حاضری نہ دی ہو۔ وہ یہ سوچ کر کبیدہ خاطر ہو جاتے تھے کہ جنّت البقیع میں سلطان عبدالعزیز نے قبّے مسمار کروا دیئے ہیں۔

دیگر مصروفیات کے علاوہ پنجاب اسمبلی پھر مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے ان کا اکثر لاہور آنا ہوتا، میں نے دو چار دفعہ عرض کیا کہ وہ میرے ہاں قیام کریں، یہی جواب ملتا "مجھے لوگ ملنے آتے ہیں، انہیں دُور آنا پڑے گا، تمہیں بھی تکلیف ہو گی"۔ دراصل وہ خوددار اور آزاد منش تھے، ہم سے کوئی خدمت لینا گوارا نہ کرتے بلکہ ہر طور ہمیں نوازتے۔

۱۹۵۱ء میں جب مجھے پہلی مرتبہ ضلع کا چارج ملا اور بھائی ترقی پا کر لیفٹیننٹ کرنل ہوئے تو ہم دونوں کو ابّا کی طرف سے اپنی پسند کی ایک ایک کار تحفتہً ملی اور نیا گھر بسانے کے لیے پورا ساز و سامان، مجھے خُوب یاد ہے اُن دنوں ابّا کے پاس کار نہیں تھی۔

یہ شفقت مجھ پہ ضرور تھی کہ جب بھی لاہور میں قیام ہوتا رات کا کھانا میرے ہاں کھاتے، وضعداری ایسی کہ جب لاہور آتے سب احباب کو مل کے جاتے شادی بیاہ ہو یا مرگ کوشش کر کے شریک ہوتے، عمر کے آخری حصّے میں اُن کی صحت اچھی نہیں تھی، قویٰ ساتھ نہیں دیتے تھے لیکن وہ اسے اپنا فرض سمجھتے اور سفر کی صعوبت بھی برداشت کر لیتے۔

چند سال ہوئے خواجہ عبدالرحیم کے ہاں چائے کا دور چل رہا تھا میز پر اُن کی اہلیہ اور بڑا بچہ موجود تھے دفعتاً خواجہ صاحب نے طارق سے مخاطب ہو کے کہا:

"طارق! اچا کو دیکھتے ہو؟ ایسے بزرگ روز روز پیدا نہیں ہوتے، یہ وہ شخص ہے جس نے مقدمے کے دوران میری مدد کی اور اُس وقت جب سب لوگ میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے انہوں نے یہ کہتے ہوئے کہ تمہیں ضرورت ہو گی دس ہزار روپے میری جیب میں چپکے سے ڈال دیئے تھے۔"

ابا جھینپ سے گئے اور دوسری طرف تکنے لگے۔

"نہیں نہیں رحیم ایسی کیا بات تھی......."

یہ دس بارہ برس پہلے کی بات تھی لیکن میں اس بارے میں قطعی بے خبر تھا۔ انہوں نے کسی سے ذکر تک نہ کیا تھا۔

عمر کا بیشتر حصہ ابا کو ایک عزیز سے بہت پیار رہا۔ پھر وہ کسی بات سے آزردہ ہو گئے اور ملنا جلنا ترک کر دیا، انہیں ٹائیفائیڈ ہو گیا، بخار نے طول کھینچا اور وہ کافی عرصہ صاحبِ فراش رہے۔ ہفتہ میں دو دفعہ ابا ان کی عیادت کے لیے جاتے، وہاں سرد مہری کا یہ عالم تھا کہ وہ دیکھتے ہی پہلو بدل لیتے، ان کے بھائی ابا سے باتیں کرنے لگتے، یہ ہفتوں بیمار پرسی کے لیے جاتے رہے، ان کی عدم توجہی کا ملال دل پر نہ لائے۔

۱۹۵۰ء میں سنٹرل ایکسائز کے ایک انسپکٹر لائل پور میں تعینات ہوئے اور یو پی سے کسی پرانے دوست کا تعارفی خط لائے، چنانچہ سوٹ کیس اور بستر ایک کمرے میں رکھ دیا گیا، ہفتہ دس دن کے بعد واحدی صاحب نے ابا سے کہا: "تلاش کے باوجود رہائش کے لیے خاطر خواہ مکان نہیں مل سکا۔"

ابا نے خوش مزاجی سے کہا "ہم نے کب کہا ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

وہ چھوٹے بھائیوں سے گھل مل گئے اور خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے رہنے لگے، چند ماہ بعد انہوں نے کرایہ کے مکان میں اُٹھ جانے کی اجازت مانگی، ابّا نے ہنس کے کہا، "اب ہم اجازت نہیں دیں گے۔" چنانچہ تبدیلی تک یعنی تین سال ہمارے ہاں ہی رہے۔

حافظ صاحب مسلم ہائی اسکول میں دینیات پڑھاتے تھے، جو سلسلہ بچّوں کی تعلیم سے شروع ہوا تھا ابّا کے ساتھ رفاقت اور پھر دوستی پر منتج ہوا۔ ابّا کے ہاں ان کا قیام دس سال رہا۔ جب اسکول سے ریٹائر ہوئے اپنا کمرہ مقفل کر کے گوجرانوالہ چلے گئے، وہ کمرہ دو سال مقفل رہا، وفات سے چند ہفتے پیشتر ابّا جان نے انہیں خط لکھوایا "بیٹھے لیٹے میری نگاہ آپ کے کمرے کی طرف اُٹھ جاتی ہے تو آپ کی یاد ستاتی ہے۔"

ان کی طبیعت میں صلۂ رحمی بدرجۂ اتّم موجود تھا اُن کا پُر درد دِل سب کے لیے دھڑکتا تھا، ہر حال میں انہیں حاجت مندوں کی دلجوئی منظور تھی، اُن کے در سے کوئی خالی ہاتھ نہ جاتا، کسی کو تعارفی خط دے دیا، کسی کے لیے فون کر دیا، کبھی کسی اجنبی کے ساتھ خود چل کھڑے ہوئے تاکہ اس کی حق رسی ہو جائے، وہ لوگوں کے معاملات میں ذاتی دلچسپی لیتے تھے، کام کہہ کے کوئی بھول بھی جاتا لیکن یہ نہ بھولتے، حتی المقدور کوشش کرتے کہ وہ کام ہو جائے چونکہ اس سعی کی بنیاد اخلاص اور بے غرضی پر ہوتی انہیں ہر کام میں تائیدِ ایزدی حاصل رہی جس کام کا بیڑہ اُٹھایا کامرانی نے اُن کے قدم چُومے، لوگ ہنس کے کہتے "شیخ صاحب ہم سے یوں کام لیتے ہیں جیسے ہم پہ احسان کر رہے ہوں۔"

راسخ الاعتقادی میں وہ سیسہ پلائی دیوار تھے۔ جب ۱۹۴۷ء میں خون آشام فسادات کا سلسلہ شروع ہوا تو ابّا ہندوستان کی مجلسِ آئین ساز کے رُکن کی حیثیت سے دِلّی میں تھے اور مقبول بھائی کے پاس مقیم تھے، بھائی اُس زمانے میں ریکروٹنگ آفیسر تھے۔

فسادات کی آگ تیز ہوئی تو متعدد دوست احباب اس مکان میں اُٹھ آئے، دروازے پہ پہرہ ہونے کی وجہ سے اس مکان کو نسبتاً محفوظ سمجھتے تھے۔ جب ہر طرف آگ لگ گئی اور مسلمان محلّوں پہ منظم حملے ہونے لگے تو بھائی خود ملٹری ٹرک چلا کے گئے اور چند دوستوں کو اُنکے مکانوں سے نکال لائے۔ ہمارے عزیز دوست سیّد محمّد نواز اور شکور احسن نے بھی "مہاجر" بن کے اسی مکان میں پناہ لی۔

شکور احسن کا کہنا ہے کہ ایک دن گولیاں چلنے کی آواز اتنی شدید تھی کہ ہم ہراساں ہو گئے ہم نے ابّا سے پوچھا: "اب کیا ہوگا؟"

اُنہوں نے بجمعیتِ خاطر کہا: "ہوگا کیا؟ دیکھو سامنے پتّے ہل رہے ہیں؟"

"جی ہاں!"

"یہ کس کے حکم سے ہل رہے ہیں؟"

"اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔"

"تو سوچو جب اُس کے حکم کے بغیر پتّہ تک نہیں ہل سکتا تو تمہارا بال بیکا کون کر سکتا ہے؟ جو اُس کی مشیّت میں ہے ہو کے رہے گا۔"

وہی راسخ الاعتقادی اُنہیں اُن دنوں نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لیے جامع مسجد تک پا پیادہ لے گئی تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر مسلمانوں کی لاشیں پڑی تھیں لیکن اس مردِ خدا نے پھندنے والی سُرخ ٹوپی کو سر سے اُتارنا گوارا نہ کیا۔

ایک چابکدست صنّاع نے صفاتِ ستودہ کی مختلف التّوع ٹکڑیوں کو ایک دوسرے میں سمو کے ایک پیاری شخصیت کو جنم دیا تھا، ایک جاذب، زوردار شخصیت جو بیک وقت عظیم بھی تھی اور محبوب بھی۔ اُس کی آبیاری اُنھوں نے خود اعتمادی اور قوتِ ایمان سے کی تھی، اولعزم، غیر متزلزل، اس خود اعتمادی کی اساس وحدہٗ لاشریک پر تھی، انہوں نے مجھے بتلایا تھا کہ ملازمت کے اوّلین حصّے میں گلبرگہ واٹر ورکس کی تکمیل انہوں نے

کروائی تھی اور میر محبوب علی خاں نظامِ دکن رسمِ افتتاح کے لیے آئے تھے، لوگوں نے بگلوس پہن رکھے تھے اور وہاں کے آداب کے مطابق تین دفعہ جُھک کے کورنش بجا لائے۔ ابّا نے کہا مَیں سوٹ میں تھا، مَیں نے ہاتھ اُٹھا کے سلام کیا، اُنھوں نے پوچھا یہ شخص کون ہے؟ مصاحبوں نے عرض کی کہ ایک پنجابی انجینئر ہے ۔

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام
(اقبالؔ)

انہیں اپنے خالق پر پورا بھروسہ تھا بلکہ بسا اوقات مجھے یہ احساس ہوا کہ انہیں اس رشتے پر ناز تھا جو بندے اور معبود کے درمیاں قائم ہو گیا تھا ۔

من دست بہ ہیچ دستگیری ندہم
کالیشاں ہمہ فانی اند و پائندہ توئی
(ابوسعید ابی الخیر)

شاید یہی وجہ تھی کہ ملازمت کے دوران اور بعد میں سیاسیات میں حق کی بات برملا کہہ دیتے، طاقتور عناصر کی طرف سے شدید مخالفت بھی ہوئی لیکن ان کا دامن کبھی سازش اور ریشہ دوانی سے آلودہ نہ ہوا۔ انہیں باری تعالیٰ کی ذات پہ اس حد تک اعتماد تھا کہ وہ اسے غیر ضروری سمجھتے تھے :

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (حق ظاہر کرنے کے لیے خدا ہی کافی ہے)

انہوں نے زمانے کے جابروں سے ٹکر لی لیکن یاد نہیں پڑتا کہ کبھی زک اُٹھائی ہو، کردار خواہ کتنا ہی بلند ہو یہ فانی انسان کے بس کی بات نہیں، تو وہ اقبال کی بلندی تھی ستارے کا اوج تھا یا رحمتِ خداوندی کا سایہ کہ وہ ہر موقع پر سُرخرو ہوئے؟ ان کے انتقال پر چودھری محمدؐ علی صاحب نے میرے لیے یہ نکتہ حل کیا، فرمانے لگے "اللہ میاں بھی ایسے بندوں کو عزیز رکھتے ہیں جو اس کی اطاعت اور خلقِ خدا کی خدمت سے نہیں چُوکتے "

وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (اور احسان کرو بے شک اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)

ابا نے صنعت و حرفت کی طرف توجہ دی لیکن دیکھ بھال کے لیے شاذ ہی تشریف لے جاتے، استغنا کی رمق تھی یا ملّی اور سماجی کاموں کی کشش وقت اور قویٰ کا بہت کم حصّہ ذاتی کاموں پر صرف ہوتا، تاہم وہ دنیاوی مسائل کے متعلق متفکر ہو جاتے تھے۔ ان کی عمر اور خرابیٔ صحت کے پیشِ نظر یہ بات میرے لیے تکلیف دہ تھی، مَیں نے آخری دنوں میں ایک مرتبہ کہہ دیا کہ داداجان نے تو وفات سے پندرہ برس قبل دنیاوی کاموں سے ناطہ توڑ لیا تھا آپ اتنا فکر کیوں کرتے ہیں؟ وہ کچھ لاجواب ہو گئے، کہنے لگے: "یوں سمجھ لو مجھ میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں، میرے اعصاب اتنے قوی نہیں"۔

بعد میں مجھے اپنے کہے پر پشیمانی ہوئی کیونکہ ابا کا نقطۂ نظر صحیح تھا۔ دنیا میں رہ کر دنیاوی آلائشوں سے پاک رہنا مردانگی کی بات ہے ؎

آشنایانِ رہِ عشق دریں بحرِ عمیق
غرقہ گشتند و نگشتند بآب آلودہ
(حافظ)

جب ننھے شیخو کے چہرے پہ فرشتوں ایسی معصومیت کھلتی ہے اور وہ مجھے کہتا ہے "ابو مجھے سلا دیں"۔ تو میں پیار سے اس کا گال سہلاتے ہوئے کچھ اناپ شناپ کہتا ہوں، دوسرے لمحے اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگتی ہیں اور نیند کی پریاں اُسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں تو مجھے یاد آتا ہے کہ ابا بچّوں کی صحت کے متعلق فکرمند ہو جاتے تھے، ایک دفعہ مجھے کہنے لگے "جب تم نے پندرہ ہزار روپے کے متعلق لکھا تو مَیں کانپ اُٹھا، مَیں سمجھا تم بچّوں کے علاج کے لیے باہر جا رہے ہو"۔ انہوں نے زہرا سے بھی کہا تھا "مجھے تمہارا بڑا خیال رہتا ہے، تم کس طرح انگلستان جا کر دو بچّوں کا آپریشن کرواؤ گی"۔

آج بھی وہ محبّت بھری باتیں کانوں میں گونجتی ہیں "۔ آج واپس نہ جاؤ کل تو چھٹی ہے، نہیں بھی تو چھٹّی لے لو" ۔ "کورس پہ سال بھر کے لیے مُلک سے باہر جاؤ یا چھ ماہ کے لیے، ہماری نظروں سے تو اوجھل رہو گے۔"

کس اصرار سے انہوں نے اپنی گاف کٹ مجھے دی تھی "۔ تم کھیلتے کیوں نہیں، گاف کھیلا کرو"۔ مَیں سامان باندھے لاہور آنے کے لیے تیار تھا، گاف کِٹ جس ملازم کے سپُرد کی تھی وہ نہار رہا تھا، مَیں نے کہا بھی "۔ ابّا پھر لے جاؤں گا"۔ لیکن جب تک ملازم کِٹ لے کر آ نہیں گیا علیل ہونے کے باوجود وہ کار کے پاس کھڑے رہے ۔

دل کا دَورہ پڑنے کے بعد وہ خاصے کمزور ہو گئے تھے۔ صحت و وجاہت کی وہ تصویر جو میں نے کبھی دیکھی تھی دھندلا گئی تھی ۔ چہرے کے نقوش اُس فریم کی مانند تھے جس نے کبھی ایک دلپذیر تصویر کو ہالے میں لیا تھا ۔ جو گھوڑے کی سواری میں انتھک مشہور تھے تکیوں کا سہارا لے کر بیٹھنے لگے ۔ تکلّم میں بھی دشواری ہونے لگی ۔ بات بات پہ سانس پھول جاتا، وہ کڑک دار آواز جس میں بادل کی گھن گرج تھی اب ماند پڑ چلی تھی ۔ قانونِ قدرت کے مطابق "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک" کا عمل جاری تھا ۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنا تبسّم بجھنے نہ دیا ۔ اس حالت میں بھی تازگی اور شگفتگی برقرار رہی، لیکن سانس پورے ہو چکے تھے، وقت کی ریگِ رواں شیشۂ ساعت سے قریباً گزر چکی تھی، چند ذرّے باقی تھے جن کی آب و تاب اب تک قائم تھی، وہ جسے زندگی سے والہانہ شغف تھا، جس کی حیات "حالیہ غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز" کی تفسیر تھی، آخری دنوں میں زندگی سے شیفتگی کم ہونے لگی تھی، آفتابِ شام کا جلال سنولا گیا تھا ۔ جب آخری عید پر ہم اُن کے گھر جمع ہوئے تو کِسے معلوم تھا کہ ہم اُن کے مہمان نہیں وہ ہمارے مہمان ہیں ۔

ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک دن یہ گھر اُن سے محروم ہو جائے گا۔ لیکن یہ چشم زدن میں ہو گیا۔ احساس اور تجسیم کی دُنیا کیا "مایا" کا کھیل تھا؟ کل تک ان کی باتیں تھیں، مسکراتا ہوا چہرہ تھا، شفقت بھری نظر تھی، لیکن آج کچھ نہیں۔ بے رحم یادوں کے سوا کچھ نہیں۔ کیا ہمیں جرمِ محبّت کی سزا ملتی ہے؟ درد اور تاسّف کی لہر آتی ہے اور دِل کے کنارے سے ٹکرا کر بے بسی کے سمندر میں گم ہو جاتی ہے۔ دردِ فراق کا تاسّف اس بات کا کہ قرب و حضوری کے کتنے ہی مواقع کھو دیئے۔

مَیں نے کہیں کہا تھا ہمیں موت سے سمجھوتہ کر لینا چاہیئے۔ ذہنی طور پر یہ دنیا چھوڑنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے یعنی موتوا قبل ان تموتوا (موت سے پہلے مر جاؤ) لیکن اسے کیا کیجیئے کہ تب بھی ہم عزیز ہستیوں کی مفارقت سے سمجھوتہ نہیں کر پاتے۔ صبر اور استقلال کے عزائم دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

جسٹس یعقوب علی نے کہا "جالندھر میں مَیں اپنے والد کو دفنا کے لوٹ رہا تھا۔ دنیا میری نظر میں اندھیر تھی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ والد مرحوم کی آخری بیماری میں مجھے انکے ساتھ طویل نشست نصیب ہوئی اور دلی باتیں سننے کا موقع ملا۔ اگر ان کی بیماری طول نہ پکڑتی تو مجھے وہ قرب نصیب نہ ہوتا۔ یہ بجائے خود مقامِ شکر تھا۔ اس خیال سے ڈھارس بندھی اور غم کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا" یہ اللہ میاں کا کرم تھا کہ ہمیں بھی مسلسل رفاقت کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ رفاقت جس قدر طویل ہو مفارقت اسی قدر تکلیف دہ ہوتی ہے۔

کیسے باور کر لوں کہ وہ شخصیّت جس سے مل کر زندگی پُر اُمّید ہو جاتی تھی اب تہِ خاک ہے، یہ جُدائی عارضی ہے تو وصلِ دوام کب نصیب ہو گا؟ بشارت ہے۔ الموتُ جسرٌ یوصلُ الی الحبیب (موت ایک پُل ہے جو ایک دوست کو دوسرے دوست سے ملا دیتا ہے)

اباجان نے جاتے ہوئے بھی خراجِ عقیدت وصول کیا ۔ تاروں کے انبار، تعزیت نامے، سوگواروں کا ہجوم، ان کی عظمت کا اتنا شدید احساس ان کی زندگی میں نہ ہوا تھا۔ علی الصبح لوگ تعزیت کے لیے آنے لگتے، رات گئے تک تانتا بندھا رہتا جب میو ہسپتال میں داخل تھے : نرس نے کہا تھا، بادشاہوں کی طرح گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں، ہر دم دربار لگا رہتا ہے ۔ وہ میلہ مرنے کے بعد بھی قائم رہا۔ لائل پور ایک عظیم شہری کا ماتم کر رہا تھا ۔ دُور اُفتادہ علاقوں سے پرانے رفقائے کار، مخلص دوست، سوگواروں میں چھوٹے بڑے سبھی شامل تھے ۔ انتظامیہ اور عدلیہ کے سربراہ، مدبّر سیاستدان!

چودھری سر ظفر اللہ خاں نے بھائی کو کہا "تم روتے کیوں ہو؟ تم اُس باپ کے بیٹے ہو جسے قائدِ اعظمؒ نے ریٹائر ہونے کے بعد ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کا ممبر نامزد کیا ۔ بلاشبہ وہ بڑے آدمی تھے ۔ میرے ذہن میں جو اُن کی تصویر ہے وہ ہے ہنس مکھ، خوش باش اور دبنگ!"

سردار بہادر خاں نے لکھا " جگت چچا اُن اقدار و روایات کے علمبردار تھے جن میں خلوص کی تابندگی اور ملک و ملّت کی خدمت کے لیے سچّی تڑپ تھی "۔

سوگواروں میں متعدد گمنام لوگ تھے جنہیں ہم بھائیوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا ۔ جو کہتے تھے وہ ہمارا باپ تھا، ہم بے آسرا ہو گئے، جو اُن کے احسانات یاد کر کے رو رہے تھے ۔ غلام محمدؐ نے کہا "میاں جی! آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟ مَیں کسی زمانے میں آپ کے ہاں ڈرائیور تھا ۔ پچھلے سال آٹے کی قلت تھی ۔ مَیں نے میاں صاحب کو آکر کہا میرے گھر میں آٹا نہیں، انہوں نے بی ۔ ڈی ممبر کے نام خط دیا کہ پرمٹ بنوا دے ساتھ کچھ رقم دی اور کہا "آٹا گھر پہنچا کے میرے پاس آنا "۔

ایک اہل کار نے کہا " مجھ سے ہمیشہ شفقت کا برتاؤ کرتے، اُن کے احسان مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے ۔ شہر میں مکان بنانے کے لیے پلاٹ لے کر دیا ۔ میری بیٹی نے بی ۔ ٹی کیا تو

اسے ملازمت دلوائی اور حسبِ منشا تبادلے میں میری مدد فرمائی۔"

کرم دین کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ وہ کالج کے زمانے میں چند سال ہمارے ہاں رہا تھا۔ پھر اُس نے برسوں کلرکی کے طمانچے کھائے۔ اب سر کے بال کھچڑی تھے۔ وہ کہہ رہا تھا کیسی برکت اُٹھ گئی۔ اِس سانحہ کی کسک اُن لوگوں سے پوچھئے جن کی پریشان حالی میں مرحوم نے دستگیری فرمائی۔

انتقال کو چند ہفتے گزر چکے تھے۔ بھائیوں میں سے کوئی گھر پہ نہ تھا۔ کسی دیہات سے چار کہار ایک اُستاد کو چارپائی پہ اٹھا کے لائے۔ اُس نے اندر کہلوا بھیجا "میں بیمار ہوں، شیخ صاحب کے افسوس کے لیے آیا ہوں۔" بعد میں مَیں نے یہ بات سُنی تو دِل دہل گیا۔ جانے کیا جذبہ تھا جو اُسے اس حالت میں کشاں کشاں لے آیا تھا۔

چودھری عصمت اللہ خود زخم خوردہ تھے۔ جواں سال بیٹا، بہو اور پوتی کار کے حادثہ میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس حادثے نے ان کی فطری شگفتگی چھین لی۔ تعزیت کے لیے آئے تو کہنے لگے "شیخ صاحب کے پاس بیٹھ کے بڑا سکون ملتا تھا۔ اُن کی باتیں سُن کے بڑی ڈھارس بندھتی تھی۔" یہ کہا اور ڈھائیں مار مار کے رونے لگے۔

ہم نے دنیاوی مدارج کی منزلیں طے کیں لیکن ہمیشہ انھی کے نام سے منسوب ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں پیش از وقت ترقی پاتے پر مَیں نے مشرقی پاکستان سے اباّ کو لکھا تھا "دریا کے کنارے اس کشادہ بنگلے میں مَیں تنہا ہوں۔ درختوں کے جھنڈ اور سبز گھاس کے وسیع قطعے میرے اِرد گرد بکھرے ہیں۔ یادوں کا ریلا مجھے دُور لے گیا ہے۔ میرے بچپن کا فیروزپور پھر ۱۹۳۰ء سے لائل پور میں قیام، آزادی سے پہلے کا صاف ستھرا لائل پور، گرمیوں کے مہینے طویل اور لامتناہی، پھر سرما کی چمک دار دھوپ، زراعتی کالج روڈ پر پہلا مکان جہاں میں نے سِن شعور کی بہت سی منزلیں طے کیں، مَیں سوچتا ہوں انسان حادثات کی تخلیق ہے۔ مَیں وہی کچھ ہوں جو مَیں نے والدین سے وِرثے میں پایا۔ جو مَیں نے

اُس ماحول سے حاصل کیا جس میں میری نشوونما ہوئی۔ کتابیں، اساتذہ کرام، اقربا، احباب، وہ لوگ جنہوں نے میری زندگی کو متاثر کیا۔ وہ چیزیں جن سے رغبت یا نفرت ہوئی۔ ماں باپ کا احسان کبھی نہ چُکا سکوں گا۔ جب پلٹ کے دیکھتا ہوں تو پس منظر میں آپ دونوں کی تصویر آویزاں پاتا ہوں۔ حسبِ معمول امّی کا چہرہ مہر افشاں ہے۔ آپ کے باوقار اور پُرتمکنت چہرے پر دلفریب ملائمت آچلی ہے۔ وہ پُر رعب شخصیت جس سے کبھی دبدبہ مترشح تھا، شفقت میں ڈھل گئی ہے۔ ایسے میں اگر طلسمات کی پری مجھ سے کہتی، کوئی ایسی خواہش بتلاؤ جو میں فوری طور پر پوری کردوں تو میں سوچ میں پڑ جاتا کہ جواب میں کیا کہوں —— دل جذبۂ تشکّر سے لبریز تھا۔ میں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔"

ان کی وفات سے چند ماہ پیشتر پانچ سالہ ندیم نے اچانک سوال کیا تھا: "ابّو یہ دن کب ختم ہوں گے؟ صبح ہوتی ہے پھر شام ہو جاتی ہے، پھر صبح ہوتی ہے —— تو یہ دن ختم نہیں ہوں گے کیا؟"

میں ذرا لڑکھڑا گیا —— "بیٹے، جب تک زندگی ہے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جب کوئی مر جاتا ہے تو اُس کے لیے یہ دن رات ختم ہو جاتے ہیں۔

"اُسی کے لیے یا سب کے لیے؟"

"صرف اُسی کے لیے۔"

ہم پائیں باغ میں بیٹھے تھے۔ ندیم چاند کی طرف تکنے لگا۔ خنک چاندنی ہمیں لوری دے رہی تھی۔ ہوا کے نرم جھونکے سفیدے کے پتوں کو سہلا رہے تھے اور میں یہ سوچے بغیر کہ میرے اردگرد ننھی جانیں اس فلسفہ کا بوجھ برداشت نہ کر سکیں گی —— "سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات" کے بند کی تفسیر بیان کر رہا تھا کہ وہ ذاتِ اقدس، اُس تارِ حریرِ دو رنگ سے کیسے قبائے صفات بناتی ہے۔ دن اور رات، جلال و جمال اور پھر قہاری و غفاری کا بظاہر تضاد ایک ہی ذات میں ضم ہوتا ہے۔ آج اُس سلسلۂ

روز و شب کا دروازہ ابا پہ بند ہو گیا تھا۔

چند روز پیشتر ابا کے دوست اور رفیقِ کار میاں افضل حسین نے باتوں میں کہا تھا "بیٹا ہمارا کیا ہے۔ ہم پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ جانے کب گاڑی آ جائے"۔
"میاں صاحب! آج آپ کی آنکھیں سُرخ ہو رہی ہیں۔ میرے ابا کی گاڑی نکل گئی ہے نا......!"

وہ دن بہت سرد تھا جب ابا چلے گئے۔ سرِ شام بادل گھِر آئے تھے۔ رات گئے تک بارش کے تھپیڑے نیند سے چونکا دیتے تھے۔ صبح بھی مطلع ابر آلود تھا۔ خنکی فضا میں رچ گئی تھی۔ جب ہم لائل پور کی جانب روانہ ہوئے بوندا باندی پھر شروع ہو گئی ع

ابر می بارد و من می شوم از یار جُدا

گدلا پانی سڑک پر بہہ رہا تھا یا اِرد گرد نشیب میں جمع ہو گیا تھا۔ وہ اُداس سفر بھی عجیب تھا۔ آج وہ ہستی ہماری منتظر نہ تھی مگر مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں "سردی زیادہ ہے۔ میں خود کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ موسم کھُل جائے تو آنا"۔

ہر چیز اپنی جگہ پہ ہوتی تھی۔ کاغذات، فائلیں، خطوط، مختلف اداروں سے متعلق میٹنگ کا ایجنڈا، روئیداد، رپورٹ! لیکن آج کمرے میں کوئی چیز نہ تھی۔ پرانا کلاک اور کیلنڈر تک اُتار لیے گئے تھے۔ وہ عمر بھر خوش پوش رہے۔ آج ایک سفید چادر آخری زینت تھی اور چہرے پر سکون جیسے کہہ رہے ہوں ؎

سانوں تاڑی مار اُڈا نہ باہُو
اساں آپے اُڈن ہارے ہُو

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝ الفجر (اے ایمان پانے والی رُوح اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل، تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی)

"سہانی یادوں کی غلام گردش میں ابا جان کی تصویر ازلی نور سے رخشندہ ہے"۔ ایک

لفظی تغیر کے ساتھ میں نے یہ الفاظ ڈیوک آف ونڈسر سے مستعار لیے ہیں۔ جب ہم متفرقات کے ذخیرے کھنگال کر اثاثہ از سرِ نو سنوارتے ہیں تو شکستہ فریم سے کسی بچھڑے ہوئے کی تصویر نکال کر کس پیار سے گرد پونچھتے ہیں۔ اُسے دیکھتے ہی یادوں کے سیلاب اُمڈ آتے ہیں۔

خوشا وہ صنم خانہ جو دل کے کسی گوشے میں آباد ہے — اور — یاد کا پہلو اس خوشبو سے مملو ہے جو گزر گئی۔ درد کا دامن اس دولت سے معمور ہے جو بکھر گئی۔

کھجور کے پتّوں میں سے اُبھرتا ہوا زرد چاند جدائی کا سندیسہ لایا تھا، شاداب فضائیں گواہی دیں گی کہ یہ باتیں یاد کر کے میرا گلا رُندھ گیا تھا۔

برہا کی اگنی ٹھنڈی پڑ جائے گی، ہجر کی رات کملا جائے گی۔ صبر کی اوس دھیرے دھیرے اترے گی۔

عالمے صاحبِ دل است اما کسے بیدل نشد

۱۹۶۹ء

یاروں نے کتنی دُور بسائی ہیں بستیاں

لوگ ایئرپورٹ پر جمع ہو گئے تھے، عزیز و اقارب، دوست احباب، فوجی اور سیویلین، بارات بن گئی تھی، صرف دُلہا کے آنے کی دیر تھی، یوں بھی شہر میں جگہ جگہ منقّش سائبان اور قناتیں لگی تھیں، ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے تھے، گلابی جاڑے تھے، بہت سے لوگوں نے شادیاں رچائی تھیں۔

ڈھاکہ سے فلائیٹ مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے آ گئی ...... جسیم جہاز فضا میں دیکھ کے بچّے تالیاں بجاتے تھے، آج اُس پر نظر پڑتے ہی کلیجہ منہ کو آ رہا۔ ایک مہیب پرندے کی طرح چنگھاڑتا ہوا جیٹ ٹارمیک کی سطح کے متوازی ہو گیا تو دل سے بے اختیار نکلا

ساربان آہستہ راں کآرامِ جاں در محمل است

جب طیارے نانی امّاں کے مکان پر سے گزرتے تو وہ کہہ اُٹھتیں "تمہاری خیر، سب مسافروں کی خیر، جن ملکوں میں تم جا رہے ہو اُن کی خیر" اُن دعاؤں میں سادگی اور نیکی جھلکتی تھی، آج ایک طیارہ اُن کے پوتے کا جسدِ خاکی لا رہا تھا، بیوی کا لٹا سہاگ، بہنوں کی آنکھوں کا بے نور تارا، بچّوں کا خاموش باپ ...... پار سال جب احمد[1] چھ ہفتے کے

---

[1] کرنل احمد حسین مرحوم (پاکستان آرمی میڈیکل کور)

لیے امریکہ گئے تو میں نے صفیہ سے کہا تھا صبا اپنے پاپا کو بہت یاد کرتی ہو گی، آج جو صبا پوچھتی ہے پاپا کہاں ہے تو اُس سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا، بیٹی تمہارے پاپا سچ پہ نہیں گئے۔ وہ دُور دیس چلے گئے، بہت دُور، انسانی دسترس سے دُور .... لیکن احمد کے لیے آج کا سفر ایک گام سے زیادہ نہ تھا، اُس میں تکلیف تھی نہ کش مکش، چند لمحوں میں وہ زندگی کی جد و جہد سے آزاد ہو چکے تھے، وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات، دُنیا کے دھندے کہاں ختم ہوئے تھے، بچّے کمسن تھے، اُن کی تعلیم نامکمل تھی، مستقبل محض خاکہ تھا، اُس میں رنگ کہاں بھرا تھا لیکن آفتاب نصف النّہار پہ تھا کہ گہنا گیا، وہ اپنے عروج پہ تھے کہ موت کی زردی کھنڈ گئی، بیوی بچوں کے بندھن، بہن بھائی، رشتے ناطے، یہ زنجیر در زنجیر پیچ در پیچ اُلجھنیں، اپنے پرائے سب ساحل پہ رہ گئے، حیات و ممات کے درمیان ایک لمحہ حائل تھا جو پھیل کے بیکراں ہو گیا، قسمت کے دو راہے کا فیصلہ کُن لمحہ!

صفیہ غم سے نڈھال تھی، آناً فاناً اُس کے سر پہ قیامت ٹوٹ پڑی تھی، جہاز سے اُترتے ہوئے وہ ایئر ہوسٹس کا سہارا لیے تھی کہ بڑھ کے میں نے اُسے آغوش میں لے لیا، جی چاہتا تھا کہ دھاروں دھار روؤں لیکن ضبطِ نفس کی سُولی گڑی تھی، چند منٹ میں ختم ہو جانے کا قصّہ سُن کے غیر سکتے میں آ گئے تھے، بیوی کے دل کی لگی کون بُجھا سکتا تھا، بہت دیر وہ سمجھ نہ سکی کہ یہ سب کچھ کیونکر ہو گیا، وہ رو رو کے ہر ایک کو ایک ہی جواب دیتی "کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا" پھر وہ حسرت و یاس کی تصویر بن گئی، بارِ الم اُٹھائے نہ اُٹھتا تھا، رونے پیٹنے کے بعد بے حسی کا وقفہ تھا، وہ بُت کی طرح بے جان تھی اور تصویر کی طرح خاموش، بُلھے شاہ نے ٹھیک کہا تھا

اوہ میرے سر دا چھت کڑے
میرا رانجھا ماہی ....

آج وہ چھت اُوپر آن رہی تھی جیسے وہ بے آسرا رہ گئی ہو، گھر کی ملکہ کا راج ختم ہوا، بچّوں کے لیے شفقت کے چشمے خشک ہوئے، دُنیا بھر کی نعمتیں بھی میسّر ہوں تو اس خلا کو کوئی پاٹ نہیں سکتا، احساسِ محرومی دل میں شبخون مارتا رہے گا، کون کسی کا غم بٹا سکتا ہے، کون سہارا دے سکتا ہے، عزیز دُور کھڑے ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں، جس پہ گزر جاتی ہے وہی مر مر کے جیتا ہے، یہ گھاؤ پورے طور کبھی نہ بھر پائے گا، جب بھی کوئی غم ہوگا ——— اپنا یا پرایا ——— تو زخم ہرا ہو جائے گا، زندگی کبھی تہی دامن نہیں ہوتی، اس طویل اندھیری رات میں روشنی کی کرنیں تو ہوں گی لیکن پہلا سا روزِ روشن لوٹ کے نہ آئے گا۔

اس ماتم کدے میں میری نظریں اُس ماں کی زیارت کی متمنّی تھیں جس نے احمدؐ ایسا بیٹا جنا تھا، میرا جی چاہتا تھا کہ اُن سے لپٹ کے خوب روؤں لیکن جب وہ آنسوؤں میں نہائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں تو میری ہمّت نہیں پڑی، ماں کے غم کے سامنے میرے غم کی کیا حقیقت تھی لیکن چند گھنٹوں میں بلند حوصلہ ماں ایمان کی پختگی کا مظہر تھی، احمدؐ کے چھوٹے بہن بھائی اُس نے بیوگی میں پالے تھے اور پرورش بھی ایسی کی کہ دُنیا عش عش کر اُٹھی، اُس نے زندگی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے نہ ہی کسی سے ہمدردی کی توقع کی، احمدؐ نے بھی قدم قدم پر سعادتمندی کا ثبوت دیا، ماں کا ہر حکم سر آنکھوں پر تھا، آج ماں وہ طویل رفاقت یاد کر رہی تھی "میرے بیٹے نے میرے لیے بہت تکلیف اُٹھائی، اُس نے بھائی بہنوں کو احساس نہیں ہونے دیا تھا، آج میرے بچّے دوبارہ یتیم ہوگئے"، یہ بات سُن کے کلیجہ پھٹتا تھا لیکن وہ صبر و استقامت کا پیکر تھی، آنسوؤں میں بھی اپنے عزم کی طرح ثابت قدم،

آخری سفر کی تیاری مکمل تھی، دلوں کے آبلے پھوٹ رہے تھے، درد کی لہریں کنارے سے ٹکرا ٹکرا جاتیں لیکن اُن کا زور کم نہ ہوتا تھا۔

نہیں بھولتا اُس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

جب اُسے اُٹھا کر لے چلے تو ایک گلوگیر آواز نے کہا "یارو کیا غضب کر رہے ہو، اِسے کہاں لے جا رہے ہو؟" روزِ ازل سے یہ فریاد گنبدِ گردوں تک جاتی ہے اور صدائے بازگشت کی طرح خالی ہاتھ لوٹ آتی ہے۔

سُنسان اندھیری رات میں آخری ساتھ دینے والے غم سے چُور راستہ طے کر رہے تھے، کوئی اپنے خیالات کی دُنیا میں گُم تھا تو کوئی کسی حرماں نصیب کو سہارا دیئے تھا، قدموں کی مدھم چاپ اس خامشی میں مُخل ہو رہی تھی، دُور مضافات کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں، قبرستان میں صرف لَو تھی، تاروں اور شہر کی بتّیوں کی لَو، قدیم گھنے اشجار تھے اور پھُولوں سے لدے تورستہ پودے، چند لمحوں میں آخری رشتہ منقطع ہوا چاہتا تھا، وہ ازلی تنہائی جو عمر بھر انسان کا ساتھ دیتی ہے مجبوریِ عریاں کی صورت میں جلوہ گر تھی، کیفیتِ غیاب و شہود سمجھنے کی ساعت آن پہنچی تھی، وہ کِھلتا ہوا شفیق چہرہ گُل ہو گیا، وہ سورج جو مشرقی پنجاب میں طلُوع ہوا تھا آدھی رات کے وقت مغربی پنجاب میں آن غروب ہوا، ڈھاکہ کی دعوتِ شبینہ سے لائل پور کی وادیِ خاموشاں کا سفر چوبیس گھنٹے میں طے ہو گیا تھا، مشرق سے مغرب کا سفر، زیست سے ممات کا سفر۔

احمدؒ کہتے تھے جی چاہتا ہے ریٹائر ہونے کے بعد لائل پور میں بس جاؤں، قدسی نے کشمیر میں رہ جانے کی تمنّا کی تھی ؎

دریں گلشن کہ ہم گُل ہست ہم خار
مرا ہم جائی دہ یک آشیاں دار

اور گلبنِ کشمیر نے ہمیشہ کے لیے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ پریذیڈنٹ کینیڈی قتل ہونے سے پہلے لِنکن میموریل سے واشنگٹن شہر کا نظارہ دیکھ رہے تھے، دفعتاً ایک ساتھی سے کہنے لگے میرا بس چلے تو یہیں زندگی گزار دوں، وہ آرزو پوری ہوئی، میموریل کے نیچے ڈھلوان پر اُن کی آخری آرام گاہ ہے، اے روشنیوں کے شہر! تو جگمگ جگمگ کرتا رہ،

تیرے بھرے بازاروں کی رونق کم نہ ہو، تیرے چمن لہلہاتے رہیں، آج ایک گرانبہا امانت تیرے سپرد کر چلے، انسان بھری دُنیا سے چلا جاتا ہے اور اُسے جاننے والے زندگی میں ایک خلا محسوس کرتے ہیں لیکن یہ میلے ختم نہیں ہوتے، یہ رونق کم نہیں ہوتی ......

جب میں نذیرؔ بھائی کے متعلق سوچتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ اُس رات بھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی، ایکسپریس ٹرین ٹھیک وقت پہ آکے رُکی، ایک تابوت اُتار لیا گیا جسے چند مسافروں نے خاموشی سے دیکھا، گاڑی تین منٹ سے زیادہ نہیں رُکی، گارڈ نے سیٹی دے کر ہری بتّی ہوا میں لہرا دی، زندگی کے بہاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، اُس رات گھرے سیاہ بادل گھر آئے تھے اور چاند بدلی کی اوٹ میں آگیا تھا، اتفاق سے عین اُس وقت سب بتّیاں بُجھ گئیں تو ایک جگر فگار نے چلّا کر کہا تھا "ہائے سب روشنیاں گُل ہو گئیں"، اُس کے لیے ہر طرف تاریکی تھی، ایسی تاریکی جس سے مفر نہ ہو، ڈوبتے بھائی کی جان بچاتے ہوئے نذیرؔ شکمِ سمندر کی پہنائیوں میں کھو گئے تھے، جواں سال بیوی، چھوٹے چھوٹے بچّے .... اس حادثے کو اُوپر تلے کئی سال گزر چکے تھے لیکن 'زخمِ تیغِ فرقت' شاید کبھی مُندمل نہیں ہو پاتا، گذشتہ سرما میں ایک صبح سیر کو نکلے تو جانے کیسے نذیر بھائی کی یاد آگئی، زہراؔ کی آنکھیں سُرخ کٹورا ہو گئیں، باہر گلاب کے پیالے اوس سے بھر رہے تھے، دھند میں لپٹی ہوئی یخ بستہ فضائیں دم بخود تھیں، وہ گُل گشت شروع ہونے سے پہلے ختم ہو گئی، جب چلتے راستے ویران ہو جاتے ہیں تو کھنڈر ہی راہ نورد کو راستہ بتلاتے ہیں، دورویہ درختوں کی خنک چھاؤں کہاں رہ جاتی ہے لیکن نیک لوگ یادوں کے تاج محل میں آباد ہیں، اُن کی یاد سدا بہار ہے۔

ؔ نذیر احمد مرحوم، اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس

. . . . . . اور نیازؔ صاحب؟ ایک وسیع بنگلے میں شادی کی تقریب تھی، خوب گہما گہمی تھی کہ ایک دوست نے چپکے سے کہا "کچھ سُنا آپ نے؟ نیاز کار کے حادثے میں جاں بحق ہوگئے"، چشمِ زدن میں رشتۂ زندگی منقطع ہو چکا تھا، بینڈ پر فلمی دھنیں بج رہی تھیں لیکن ماحول پہ اُداسی چھائی تھی، لوگ اسی ٹریجڈی کی بات کر رہے تھے جیسے بے وقت موت سے سبھی خائف ہوں، انسان کی بے بسی سے خائف ہوں۔

اُس روز بہار جوبن پر تھی، کچنار کے درخت کاسنی پھولوں سے بھرپور تھے اور سبز بیل سفید پھولوں سے لد گئی تھی، باغِ جناح کے اُوپر پندرھویں کا چاند اپنا ازلی سفر طے کر رہا تھا اور وہ گنجینۂ اشعار و لطائف تازہ مٹی کے نیچے دفن ہو چکا تھا، نیاز احمدؔ[1] جو محفلوں کی جان تھے جنہیں ہزاروں منتخب اشعار ازبر تھے، جن کے چٹکلے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے اب انہیں نہ دیکھ پائیں گے، مجھے مرحوم کے الفاظ یاد آ گئے "ہمیں ایک روز اس جہاں سے جانا ہے ورنہ ہمارے بچّوں کے لیے کہاں جگہ ہوگی"۔ کسے معلوم تھا کہ چند ہفتوں میں اُن کا خاک و خون میں غلطیدہ جسم چلتی سڑک کے کنارے پڑا ہوگا ـــــ بے یار و مددگار۔

خُدا بخشے وہ خُوب آدمی تھے، چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور بے تکلّفی، دنیاوی معاملات میں حق گوئی و بیباکی، انسان دوستی کا یہ عالم کہ حیدرآباد چھوڑے اُنہیں کئی سال ہوگئے تھے لیکن مجھے کئی بار فون کیا "بھیا فلاں کالج کے لیے کچھ کیا؟ میاں دیکھ لینا بڑا مستحق اِدارہ ہے، حیدرآباد پبلک اسکول کی کچھ امداد کی؟ وہ بھٹّہ بیٹھ رہا ہے"۔ یہ اسکول اُنھوں نے کمشنری کے زمانے میں بڑے شوق سے بنوایا تھا، امتدادِ زمانہ کے باوجود اُس علاقے سے اُنس قائم تھا۔

---

[1] نیاز احمد مرحوم، ممبر بورڈ آف ریونیو

دوستو! جو کرنا ہے کر ڈالو، عمرِ کوتاہ فرصت نہیں دیتی، یہ گہری نیند لیبا اوقات چور دروازے سے دبے پاؤں داخل ہو جاتی ہے، زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند، اور جو طالب علموں کے لیے وظائف مقرر کرنا تھے، کسی دُور اُفتادہ دوست کو پیار بھرا خط لکھنا تھا، کسی زخم پہ پھایا رکھنا تھا، آخر وہ کب کرنا ہے؟

ہم نے سوچا تھا نیاز صاحب لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے یونہی محفل گرماتے رہیں گے، اُن کے بیساختہ قہقہے گونجتے رہیں گے اور وہ بغل ہی میں رہتے ہیں، کبھی ہو آئیں گے، عقیدت کا اظہار گاہے ساہے بھی ہو جاتا ہے، ایسی بھی کیا جلدی ہے....

اور احمدؐ بھائی کے متعلق بھی ہمارے ذہن لاشعور میں ہوگا کہ وہ تو موجود ہیں، ہنسی مذاق کے لیے، محبّت جتلانے کے لیے ساری عمر پڑی ہے، اُن کی پوسٹنگ کہیں نزدیک ہو جائے گی، یار زندہ صحبت باقی لیکن یار نے وفا نہ کی، کوئی تنا سا چل بسے تو دل دُکھتا ہے، اُس دوست کا کیا کہیے جس کی رفاقت عمر بھر کی ہو، جس کی معیّت میں سالہا سال پُر لطف صبحیں بسر ہوئی ہوں۔

میں متعدّد بار احمدؐ بھائی کا مہمان ہوا اور وہ ہمیشہ باعثِ راحت ہوتا، ہر چھوٹی تکلیف کا خیال، مہمان کو زیادہ سے زیادہ آرام بہم پہنچانے کی سعی" دفتر جا کے گاڑی بھجوا دوں؟ آدمی جا کے سُوٹ استری کر دا لائے؟"

۱۹۵۸ء کے موسمِ بہار میں پشاور میں اُن کے ہاں قیام تھا، اُس پُرسکون ماحول میں چمن میں بیٹھے ہوئے مَیں نے اپنی ڈائری میں یہ فقرے لکھے تھے:

" معاف کر دینا ممکن ہے

اپنی محدود 'انا' سے بلند ہو جانا ممکن ہے

افسردہ خوشبو سے بوجھل فضا میں ابدی نیند سو جانا ممکن ہے"

چھ برس بعد مجھ سے پہلے احمدؐ جا سوئے، میں اُسے پیار بھرے خط لکھ سکتا تھا،

چھوٹے چھوٹے تحفے بھیج سکتا تھا، یہ جتلانے کے لیے کہ ہمارے دل میں اُس کے لیے کتنی عزّت ہے اور میں اور زہرا بسا اوقات اُس کی خوبیوں کا قصّہ لے بیٹھتے ہیں، میں ٹرنک کال کرسکتا تھا تاکہ وہ جان جائے کہ دُوری کے باوجود ہم اُسے نہیں بھُولے، اُس کا مسکراتا ہوا چہرہ اور معصوم مذاق یاد سے محو نہیں ہوئے۔

محفوظ ہیں سب یادیں اور یاد ہیں سب باتیں

لیکن وہ جُل دے گیا، وہ آناً فاناً چلا گیا اور ہم کچھ بھی نہ کرسکے، شاید پیاروں کی زندگی میں ہم اپنی محبّت اُن پہ ظاہر نہیں کر پاتے، کبھی حجاب مانع ہوتا ہے، کبھی اظہار کے لیے مناسب الفاظ نہیں ملتے، ہم پھوہڑپن سے جھجکے ہو رہتے ہیں لیکن کسی کے متعلق حُسنِ ظن رکھنا اور اُس کا اظہار لب پر نہ لانا گُن گنوانے میں بخُل سے کام لینا ہے، ہم روزمرّہ کے کاموں میں اتنا اُلجھ جاتے ہیں زندگی کے قضیوں سے اتنا تھک جاتے ہیں کہ اہم باتوں کے لیے ہمّت نہیں رہتی، شاید نادانستہ طور پر یہ موت کی حقیقت کو جھُٹلانا ہے، ہم باور نہیں کرنا چاہتے کہ ایک عزیز ہمیشہ کے لیے جُدا ہوسکتا ہے۔

جب میں نے آخری مرتبہ اُسے خُدا حافظ کہا تو سچّی بات میری زبان پر آ گئی تھی اور میں نے کہہ ڈالا تھا "میرے ننھیال میں ایک گھڑے جتنا موتی، پیدا ہوا اور وہ احمد حسین تھا" وہ سادہ دلی سے ہنس دیا تھا، میں نے سچ کہا تھا، اُس نے کبھی کسی کے ساتھ تلخ کلامی نہیں کی، طعن و تشنیع کے تیر نہیں چلائے ع

کانٹوں سے بھی نباہ کیے جارہا ہوں میں

باہمی رنجشوں سے دامن بچا کے نکل جانے والا، جلتی پہ پانی ڈالنے والا، صُلحِ کُل "با دوستاں تلطّف با دشمناں مدارا کی تفسیر، دل آزاری سے پرہیز، طنز سے اجتناب، اُس کے مذاق میں تضحیک کا شائبہ تک نہ ہوتا، اُس کے عزیز اُونچے عہدوں پر فائز تھے، اُس کے لیے یہ فخر و مباہات کا موجب تھا اور نہ رشتہ داروں کا چھوٹی جگہ پر ہونا باعثِ عار۔

احمدؐ کی بھاری بھرکم شخصیت نہ تھی کہ پہلی نظر میں آنکھ میں کھُب جائے، اُس کی جبّلی نیکی اور شرافت چپکے سے ہم آہنگ ہوگئی تھی، وہ انجانے طور پر گرد و پیش ہمدردی اور غیر سگالی کے تاثرات بکھیر دیتا، قریبی ہو یا غیر ہر اک کی خدمت کے لیے مستعد، اور آپ سوچتے تھے یہ شریف آدمی میرے لیے ناحق پریشان ہو رہا ہے، اب وہ دردمند دل ہمارے لیے نہیں دھڑکے گا۔ وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہے۔

ہماری اُمّیدیں، ہمارے خواب، ہمارے فیصلے، ان کی کیا وُقعت ہے، مجبور و بے بس انسان کی کیا وُقعت ہے؟ تقدیر کھڑی مسکراتی رہتی ہے .... نذیر چھوٹے بھائی کی جان بچاتے ہوئے ڈوب گئے، جب اُنہیں باہر نکالا گیا تو چند سانس باقی تھے، اگر بروقت طبّی امداد مل جاتی .... نیاز احمدؐ کار کے اندوہناک حادثے میں جان سے گئے، اگر ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوتے .... لیکن احمدؐ بھائی کے متعلق کیا سوچوں؟ خود ڈاکٹر، دو ڈاکٹر گھر میں مہمان، چھریرا بدن، ٹینس کا شوقین، ہر بات میں اعتدال پسند اور محتاط لیکن قلب کا پہلا دورہ جان لیوا تھا۔

آج میں تنہا ہوں، مسلسل تین روز باد و باراں کا طوفان برپا رہا، غروبِ آفتاب کے بعد میری نظر اُدپر اُٹھ گئی تو دیکھتا ہوں کہ ہلکے نیلے آسمان کا منہ دُھل گیا ہے، بے گرد و غبار سروِ سہی آسمان کی طرف سر اُٹھائے ہے، اُس کی پتّیوں میں سے چاند کی سبک نیا نظر آرہی ہے، سُندرتا میرے آنگن میں اُتر آئی ہے، اکتوبر کی دلپذیر لطافت گزر گئی، نومبر کے گلابی جاڑے رُخصت ہوئے، اب ساری رات زمستان کی اُداس چاندنی چھن چھن کے دریچوں میں سے آتی ہے، ساری رات سرد ہوائیں چلتی ہیں، درختوں سے زرد پتّے گر گر کے لڑکھڑاتے ہیں۔

کتنی یادیں غمِ امروز سے جاگ اُٹھتی ہیں
گرتے پتّوں سے بہاروں کا خیال آتا ہے
(ضیا جالندھری)

یہ کرسمس کارڈ کا موسم ہے، بے داغ برف کے مناظر، غروبِ آفتاب کے سنہرے حاشیے میں بے پہیئے کی گاڑی کھینچتے ہوئے رینڈیر، کرسمس کارڈ جو احمد لڑکپن سے بھیجتے آئے ہیں، وہ کارڈ جن کا انتظار رہا کرتا تھا،

بشاہراہِ وفا انتظار داشتم

"علی حزیں نے لکھا ہے کہ ایک موقع پر، جب اُن کا دل محبت کا نشتر خوردہ تھا، ایک شب، اصفہان کی کسی صحبت میں جو باغ میں تھی، مطرب نے ساز درست کر کے ایک شعر سُنایا، صبح تک وہی نغمہ تھا، اس شعر کو گاتا، چُپ ہو جاتا، پھر گاتا، پھر چُپ ہو جاتا، حزیں کہتے ہیں کہ معلوم نہیں کتنی مرتبہ سلطانِ رُوح نے قالب خالی کیا تھا"[1]

نہ جانے شیخ تصوّف کے کس مقام پہ تھے ورنہ روح مسافر ہونے کے بعد کہاں لَوٹتی ہے، وہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتی ہے جیسے تھکا ہوا راہوار بیساختہ "تھان" کی طرف مُڑ جاتا ہے۔

نہ خون نہ برادری نہ شہر کی ہمسائیگی، کہاں دریائے سندھ کا وہ حصّہ جہاں پنجاب اور صوبہ سرحد کی حدیں ملتی ہیں کہاں ستلج کا وہ مقام جہاں سے نہر سرہند نکلتی ہے، وہ کہاں کا رہنے والا میں کہاں کا، اُس کا ملنا ایک اتفاق تھا، میں نے زندگی کی گہرائیوں میں جھانک لیا ہے، آج معلوم ہوا عزیز ترین دوست کا چھن جانا اپنی ذات کے ایک حصّے سے ہاتھ دھونا ہے۔

ستائیس برس کی مسلسل رفاقت، مَیں اس بوجھ تلے دب گیا ہوں، امتدادِ وقت سے کسک کم ہو جائے گی لیکن اب تو یوں ہے جیسے کوئی نیند سے چونک پڑے اور دیر تک ایک خیال ذہن کے غُرفے میں پھڑ پھڑائے، جب ہمیں کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو

---

[1] بہ حوالہ صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن شروانی

یادوں کے چہرے ماضی کے دریچوں میں سے جھانک کر ہمیں پریشان کرتے ہیں، وہ ایک دوست کی موت ہو یا ایک جذبے کی . . . .

یاد آیدت آں مہر و وفا داریہا — وان درحقِ منے بلطف غمخواریہا
اکنوں بتصوّرِ جہاں باریہا — مائیم وشبِ دراز و بیداریہا

(خسروؔ)

وہ خوش گوار لمحے کتنے گریز پا تھے، "ابتدائے شوق کی لمبی ملاقاتیں" ایک مستحکم دوستی کا پیش خیمہ تھیں جو تادمِ واپسیں قائم رہی، ہم مری میں تھے کہ ستمبر میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی، یوں بھی وہ ایک یادگار سیزن تھا، انتہائی بے فکری اور غیر ذمہ داری کا زمانہ تھا، سات آٹھ احباب کی ٹولی "خوش وقتی" کی فکر میں رہتی، قہوہ خانوں میں یا کسی کی رہائش گاہ پر مجلس آرائی ہوتی، محض تفننِ طبع کے لیے کسی مصرع پر طبع آزمائی، لطیفے، خوش گپیاں اُردو فارسی اور انگریزی میں پیروڈی، فیضؔ اور راشدؔ کی نظمیں، قہوے کے دَور اور مستقبل کے سنہرے خواب، ہم اس بھول میں تھے کہ یہی زندگی ہے۔

مقامی مذاکرات میں حصّہ لینے میں امان پیش پیش ہوتا اور احباب کو بھی آمادہ کر لیتا، اگر دوستوں کی کامیابی اس کی کوشش کی مرہونِ منّت ہوتی تو وہ اسے اپنی کامیابی تصوّر کرتا اور ان کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ کے خوش ہوتا، اس حد تک وہ دوسروں کا ہو کے رہ گیا تھا۔ شاید بہ انجانے طور پر اس کی شخصیّت کی تکمیل تھی۔

۱۹۳۹ء کے سیزن میں اس کی مسلسل کوشش تھی کہ مباحثہ میں نسیم پہلا انعام حاصل کرے۔ سیر کے دوران میں مشق کروا رہا ہے، اچھے الفاظ کا ذخیرہ بڑھانے میں مدد دے رہا ہے۔ اوّلین دَور میں تقریر تک لکھ کے دینا اپنے ذمے لے لیا تھا اور جب نسیم نے پہلا انعام پا لیا تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے خزانہ مِل گیا ہو، کردار کا یہ پہلو عمر بھر نمایاں رہا۔

ہم ۱۹۴۹ء میں ٹریننگ کے لیے ڈھاکہ پہنچے تو نو بیاہتا دُلہن اس کے ساتھ تھی۔

شادی شدہ جوڑوں کے لیے اُوپر کی منزل میں کمرے مخصوص تھے، ان کا کھانا بھی وہیں بھیج دیا جاتا، باقی اصحاب میس میں کھانا کھاتے، میں ابھی ناکتخدا تھا لیکن یاد نہیں پڑتا کہ ڈھاکہ کے تین ماہ کے قیام میں اُنھوں نے کوئی کھانا میری شمولیت کے بغیر کھایا ہو، مجھے اصرار ہوتا کہ مَیں خلوت میں مخل ہو رہا ہوں لیکن اس کا فیصلہ اٹل تھا، اسے گوارا نہ تھا کہ مَیں تنہا کھانا کھاؤں۔

امان سے ہر ملاقات کے بعد محبّت میں اضافہ ہوتا مگر تشنگی رہ جاتی۔ ہر چھوٹے بڑے سے اخلاص، ہر کہہ و مہ سے اُلفت، اتنی محبّت اس کے دل میں کیسے سما آئی تھی، افسوس محبّت کا اتھاہ سمندر خشک ہو گیا۔

وہ کبھی بھی اتنا محتاط نہ تھا، نہ جانے دل میں کیا آئی کہ اس سال رُخصت پر لاہور آ گیا اور سب احباب کو مل گیا، ہمارے ہاں دو گھنٹے نشست رہی، ایک آدھ سنجیدہ بات پھر وہی ہنسی مذاق اور قہقہے، مسکرا کر خدا حافظ اور گرم جوش معانقہ، کسے معلوم تھا کہ پلک جھپکنے میں وہ ہم سے بچھڑ جائے گا۔

یہ خوشیاں منانے کا دن تھا لیکن اس دفعہ صُبحِ عید امان اللہ کی جُدائی کا داغ ساتھ لے کے آئی، دوست کو وداع کرنے کے لیے بے خیالی میں رختِ سفر باندھا، ہم ستائے بغیر منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہے تھے، باہر مناظر بدل رہے تھے، ٹنڈ منڈ درخت، چٹیل میدان، کبھی ہرے بھرے درخت اور نیشکر کی فصل لیکن دلِ ویراں جذبات سے عاری تھا، گاہے یاد کا جھونکا کچوکا دے کے نکل جاتا، اب کون مجھے آغوش میں لیکر بھینچ لے گا، وہ دہکتا ہوا گلنار چہرہ کہاں دیکھوں گا جس پہ کندن کی آمیزش جھلکتی تھی۔

چینیوٹ، سرگودھا، خوشاب اور میانوالی کی منزلیں ہم نے تیزی سے طے کیں، یہ برق رفتاری اُس طوفان کی غمّازی کرتی تھی جو ہمارے سینوں میں بپا تھا یا اُس یارِ مہرباں کے اخلاص کی آخری کشش تھی؟

آشنا یانہ کشند خارِ رہت دامنِ ما!

جب ہم میانوالی سے روانہ ہوئے سورج ڈوب رہا تھا، اب درد کی منزل قریب تھی، سلسلۂ کوہ کے اُس پار جیُوئے خون بہہ نکلی تھی، تاحدِ نظر شفق کی لالی کا تسلط تھا، تمناؤں اور آرزوں کا خون جس کے لیے سندھ کا وسیع پاٹ آئینہ لیے تھا،

سنگ نالہ می زد بر وداعِ دوست یاراں

پھر سنگلاخ پہاڑیوں کی اوٹ میں سورج غروب ہو گیا، پہاڑیوں کی ڈھلوان پہ سرمئی رنگ نے ڈیرے ڈال دیئے، دریا عبور کرنے پر شوال کا چاند اور ایک تارہ ہمارا ساتھ دینے لگے جیسے ریگستان کو پیار بھری نظر سے تک رہے ہوں، اے خُوبرُو تارے! میرے دوست کو کس کی نظر کھا گئی، زندگی کی تپتی ہوئی شاہراہ مستقل جدائی کے تب و تاب کی نشاندہی کرتی ہے، وہ سبیل کہاں ہے جہاں پیاسے مسافر تشنگی بجھاتے ہیں، آہ وہ کشیدہ قامت خُوبرو آج نظر سے اوجھل ہو جائے گا، اس سروِرواں کو خاک ڈھانپ لے گی، وہ زبان جو شیریں گفتاری کا جادو جگاتی تھی آج گنگ ہو گی۔

۱۹۴۸ء میں ہم شادی میں شرکت کے لیے عیسیٰ خیل پہنچے تو امان اسٹیشن پر موجود تھا، آج ہم نے منزل پہ منزل طے کی، سڑکیں بدل گئیں، سمتیں بدل گئیں، رات نے اپنی چادر پھیلا دی، ہمیں آخری منزل پا لینے کی جلدی ہے لیکن وہ ہمارا منتظر نہیں ہو گا، وہ جوانا مرگ عزیزوں اور دوستوں سے جا ملا ہے، وہ دل جو آئینے کی طرح شفاف تھا آئینے کی طرح ریزہ ریزہ ہو گیا۔

اُفتاں و خیزاں چند احباب پہنچ پائے باقی نہ پہنچ سکے، عید کے روز خبر نہ ملی ہو گی لیکن میرا دوست تو دریا دل تھا، ایسی باتیں خاطر میں نہ لاتا تھا، اُس نے کبھی گلہ نہ کیا تھا، آج بھی وہ تصویرِ وفا زبانِ حال سے کہہ رہی تھی

بآں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند
زما سلام رسانید ہر کجا ہستند

یہ اُفق تک پھیلاؤ، یہ وسیع و عریض قبرستان، اُن کروڑوں انسانوں کی آخری آرام گاہ جنھیں کبھی زندگی عطا ہوئی، زمانے کا بے رحم سیل اپنے دامن میں خس و خاشاک اور لعل و گوہر سمیٹتا ہوا کہاں نکل گیا، جانے صفدر اور نواز کہاں تڑپتے ہوں گے، نسیم پیرس میں کلیجہ مسوس کے رہ گیا ہوگا، امان نے فخر سے کہا تھا، پچیس تیس سال کی ریاضت کے بعد ہمیں یہ دوستی حاصل ہوئی ہے، اسے سنورنے میں اتنی دیر لگی، اب یہ انمول ہے۔ مجھے کہا کرتے ہمارا رشتہ ایسی بنا پر استوار ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتیں اس میں مُخل نہیں ہوسکتیں۔

ستائیس برس کا مسلسل ساتھ لبِ گور پہ ختم ہو گیا، یہ مال و دولتِ دُنیا یہ رشتہ و پیوند، لبِ گور تک ہی ہے۔ نشست جو اس کے اُٹھ جانے سے برہم ہوئی پھر نہ جم سکے گی۔

شکستِ جام و حریفاں شدند و مُرد چراغ

اگلی صبح فاتحہ خوانی کے لیے بیٹھے تو کنارِ سندھ سے سرد ہوا کے جھونکے اوّلین دُھوپ کی آسودگی میں گھُل کے ہمارے زخموں پہ مرہم رکھ رہے تھے۔

اے بادِ خوش کہ از چمنِ دوست می وزی

میرا دوست بھی تو قریب ابدی نیند سویا پڑا تھا۔ جیسے انجیل سے منتشر ہوتے وقت عم زاد اور خالہ زاد بھائی امان کے دوستوں سے لپٹ لپٹ کے رونے لگے، انہیں ہر دوست سے بُوئے یار آتی تھی۔ اِس شعر کا معنی اب آشکار ہوئے،

دو روزہ مہرِ گردوں افسانہ ایست و افسوں
نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا (حافظ)

وہ نہ بھُولنے والی کربناک رات، اُس رات ایک دوست نے کیا بات کہہ دی تھی "خُدا کی خدائی میں لاکھوں لوگ بستے ہیں لیکن انسان کوئی کوئی ہوتا ہے"۔

زمانے کی یہی ریت ہے وقت ہماری عزیز متاع چھین کے آگے بڑھ جاتا ہے، جو کل تھا آج نہیں، جو آج ہے جانے کل نہ ہو۔

تو اے پیماں شکن امشب بما باش !

کہ ما باشیم فردا یا نباشیم !

(فیضی)

سیّار کشتی سے چشمِ بینا دونوں کناروں پہ بکھرے ہوئے نظاروں کو وقتی طور پر آغوش میں لے لیتی ہے، وہ جنّتِ نگاہ ہی کیوں نہ ہو اس کی حقیقت ایک حسین یاد کے سوا کچھ نہیں ۔

ہم شاید انجانے طور پر ایک شخص کو پسند کرنے لگتے ہیں اور اُس میں خوبیوں کے متلاشی رہتے ہیں، گو دونوں باتوں میں مماثلت ضرور ہے، کسی کی خوُبیاں ہی ہمیں اُس کا گرویدہ بناتی ہیں، دوست کی پرکھ اُس کے جانے کے بعد ہوتی ہے، اُس کی زندگی میں ہم ایسی گہری سوچ نہیں سوچتے ۔

اماں نے بتلایا تھا کہ نیویارک پہنچنے پر اُسے محسوس ہوا تھا جیسے کوچے کے دونوں کناروں سے فلک بوس عمارتیں اُس پہ یلغار کر آئی ہوں، وہ کاٹنے کو آتی تھیں، سارا ماحول اجنبی تھا، صبح بیدار ہوا تو کوئی پُرسانِ حال نہ تھا، کوئی دوست آشنا نہ ملازم، قریب ایک ریستوراں میں ناشتہ کے لیے گیا تو دل بھر آیا، تو الہ حلق میں اٹک گیا، اکیلا ہی ناشتہ چھوڑ بھاگ کھڑا ہوا، ویٹر بھی حیران تھا کہ اس نووارد کو کیا ہوا، "شہر جتنا بڑا ہو اُتنا ہی ظالم ہوتا ہے" لیکن وہ شدید طور پر جذباتی بھی تو تھا ۔

جو کچھ اُس کے پاس تھا، وقت، قویٰ، فراغت کے لمحات؛ وہ عزیزوں اور دوستوں کے لیے وقف تھا، دُنیا دار ان چیزوں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور انہیں اپنے خاندان تک محدود رکھتے ہیں لیکن اُسے دوسروں کو شریک کرکے دلی مسرّت ہوتی، اُس کے پاس روپیہ وافر نہ ہوتا لیکن جب ایک "نشئی" دوست نے دو ہزار روپے مانگ لیے تو اس کا یہی جواب تھا " میں جانتا ہوں یہ واپس نہ کر سکے گا لیکن انکار کیسے کر دوں؟"

مردان ہو یا بنّوں، لاہور ہو یا راولپنڈی، دوستوں اور واقفوں کا تانتا بندھا رہتا،

لوگ آجا رہے ہیں، کوئی چند روز یا چند ہفتوں کے لیے ٹھہرا ہوا ہے، ایسے دُور کے عزیز یا دوستوں کے جاننے والے بھی ٹھہر جاتے جنھیں امان ذاتی طور پر نہ جانتا تھا، اُن کی بھی تواضع ہوتی، بعض اوقات اتنے مہمان آجاتے کہ برآمدے میں چارپائیاں بچھانی پڑتیں، لوگ ایسا ہجوم دیکھ کے پریشان ہو جاتے ہیں لیکن اُس کے ماتھے پہ شکن تک نہ آتی، مہمان نوازی میں غریب امیر کی تمیز نہ تھی، بعض اوقات ظاہر ہوتا کہ کوئی شخص چالاکی سے کام لے رہا ہے یا گذشتہ مرتبہ غلط بیانی کی تھی لیکن وسیع القلبی کے باعث ایسی چیزوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتا، جب ایک خیر خواہ نے خبردار کیا کہ آپ فلاں صاحب کی مدد کیے جا رہے ہیں لیکن وہ اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے جا بیجا آپ کا نام لینے سے بھی نہیں چوکتا تو امان کا جواب تھا "اُسے اپنا کام کرنے دو، میں اپنا کام کیے جاؤں گا۔" وہ پارس تھا جو اُسے چھُو گیا سونا ہو گیا۔

دوستوں اور عزیزوں کے کام تو ایک طرف ایسا بھی ہوا کہ کسی دوست کا عزیز چلا گیا تو اُس کے ساتھ بھی شفقت سے پیش آیا، تکلیف کا ازالہ کیا اور کہہ بھی دیا "تم میرے دوست کے بھائی ہو تو میرے بھائی ہوئے نا!"

ایک ضرورت مند کسی دوست کا تعارفی خط لے کر گیا، امان نے دیکھا کہ وہ راولپنڈی کی سردی میں ٹھٹھر رہا ہے تو اپنا اوورکوٹ اُٹھا لایا اور کہا کہ پہن لیجئے، رُخصت ہوتے وقت وہ کوٹ اُتارنے لگا تو امان نے کہا "رہنے دیجئے، دیکھئے کتنا بھلا معلوم ہو رہا ہے۔"

جب بڑے بھائی کو ایک عارضہ لاحق ہو گیا جو جان لیوا ہو سکتا تھا تو امان اُس غم میں شمعِ سوزاں کی طرح گھُلنے لگا، انتقال سے چند ہفتے پہلے اُسے بھائی کے رُوبصحت ہونے کی بڑی خوشی تھی، ایک ایک سے کہتا کہ دیکھئے وہ بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں۔

وہ ایک عالی ظرف انسان تھا، اُس کے قُرب سے "بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما"

کیفیت ہوئی، وہ صحبتیں خواب ہوگئیں، کیا عجب کہ 'رنج خمار' باقی ہے اور احساسِ محرومی جیسے ایک بے حد عزیز شے کھو گئی ہو .... اُس کے قہقہے دیر تک گونجتے رہتے، اس کا مزاح بے ساختہ تھا، کسی پہ چوٹ ہو بھی تو اتنی خفیف کہ اُسے گراں نہ گزرے اور اپنی خِفت مٹانے کی بجائے وہ بھی مذاق میں برابر کا شریک ہو، اُسے کسی کی دل شکنی گوارا نہ تھی۔

گرم جوشی اور خوش اخلاقی کہیئے یا خندہ پیشانی سب کو ہنس کے ملنا اُس کی عادت تھی، فطرتاً رحم دل بلکہ رقیق القلب، وہ بہت دھیما تھا لیکن نتائج و عواقب سے بے پرواحق کی بات کہہ دیتا، لوگ جلبِ منفعت کے لیے سو حیلے تراشتے ہیں، عمائدین کی دہلیز پر جبیں سائی کرتے ہیں لیکن وہ ریاکاری اور منافقت سے کوسوں دُور تھا۔ ابن الوقتی کے اِس دَور میں ایسی نظیر مشکل سے ملے گی۔

وہ انتہائی زیرک اور ذہین تھا، مردم شناس، سخن شناس، ہر اہم مسئلے پہ اُس کی رائے وقیع ہوتی، ایسے موقع پر وہ مردِ دانا کے روپ میں نظر آتا، ہوس، حسد، جاہ طلبی کی دوڑ میں حریفوں کو رَوندنے کا جنوں، وہ اپنے تئیں ان کی حقیقت سمجھے ہوئے تھا، تبھی تو وہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مسکرا سکتا تھا۔

راہ زیں دیدہ وراں پرس کہ درگرم روی
جادہ چو نبضِ تپاں در تنِ صحرا بینند
دل نبندند بہ نیرنگ و دریں دیرِ دو رنگ
ہر چہ بینند بعنوانِ تماشا بینند

(غالبؔ)

ہم ایسے دوست سے زندگی کے ادق مسائل پہ گفتگو کی تمنا کرتے ہیں لیکن دوستوں کا جھمگٹا ایسا ہوتا کہ تخلیہ قریباً ناممکن ہوتا، جن دنوں وہ لٹاف کالج میں تھا میرے ایک آدھ

بار شکوہ کرنے پر اُس نے ہنس کے کہا تھا " ہاں تمہارے ساتھ مخصوص نشست جمائے مدت ہوگئی، اَب کے ضرور ہونی چاہیئے" کراچی میں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی وہ شام جو اُس کی یاد میں بسر ہوئی اُس شام نواز نے ہچکیاں لیتے ہوئے بتلایا تھا کہ اماں سے اس کی ملاقات اُس واقعہ کے دوسرے روز ہوئی۔ وہ شش و پنج میں تھا اور کہہ رہا تھا منظور کو گلہ ہے کہ مجھے فرصت نہیں ہوتی، مَیں ایسے احباب کو کیا کروں جو ایک عمر سے مجھ سے منسلک ہیں اور برابر نبھا رہے ہیں، لیکن مَیں کبیدہ خاطر تو نہ ہوا تھا، وہ بھی انجانے طور پر اظہارِ محبت تھا، قُرب کی خواہش بلاشرکتِ غیرے

ذوقِ حضور در جہاں رسمِ صنم گری نہاد
عشق فریب می دہد جانِ اُمّیدوار را (اقبال)

میرے سامنے عید کارڈوں کا انبار ہے، اتنے کارڈ پہلے کبھی نہ آئے تھے، انہیں کیا کروں؟ بچوّں کو دے دوں جو ایسے کارڈ جمع کر کے خوش ہوتے ہیں، اُن کے گھروندے بنا کر بگاڑتے ہیں۔ ہم بڑوں کی طرح جو ساری عمر ریت کے گھروندے بناتے ہیں اور سُرابِ کامرانی کو کامیابی تصوّر کرتے ہیں۔

خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است

اُس کا نصب العین ہوگیا تھا، وہ ایک شمع کی مانند تھا جو تیزی کے ساتھ جلا کی، یہ جانتے ہوئے کہ شمع پگھل رہی ہے ہم اُس سیلِ نور کا نظاّرہ کرتے رہے، اُس کی ضَو سے انجمن کا گوشہ گوشہ مسکرا اُٹھا تھا . . . . . . ہمارا ندیم ہم سے روٹھ گیا، وہ بھرا میلہ چھوڑ گیا، ماہ و سال کی ریگِ رواں شیشۂ ساعت سے پھسلتی رہے گی، اپنے آنسو پی کے ہم آگے بڑھتے رہیں گے، غالبؔ پوچھتے ہیں

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی

فوتِ فرصتِ ہستی کا غم، یوں تو کب تک مٹتا ہے، اگر کم ہوتا ہے تو وہ ساعتیں یاد کر کے

جو ایسے حبیب کی صحبت میں بسر ہوئیں، ربودگی کے وہ لمحے جو اُس کی صحبت میں گزرے گویا ماحصلِ زندگی تھے۔

شب و روز کا یہ چکّر بیک وقت طویل بھی ہے اور مختصر بھی، دُھند اور کہر میں لپٹے ہوئے دن، اُجلے نکھرے دن، پاکیزہ شامیں اور برستی راتیں گزرتی جا رہی ہیں، دھیرے دھیرے سہم سہم کر، جیسے آنے والی تقدیر سے خائف ہوں لیکن تقدیر کا لکھّا کون مٹا سکا ہے، وقت کے اس بوجھ کو میں نے کئی بار محسوس کیا ہے اور یہی سوال ذہن میں گونجتا ہے "اگر یہی صبحیں اور شامیں بار بار لوٹ کے آئیں گی تو جلد جلد کیوں نہیں آ چکتیں"۔

میرے ترکش میں کوئی تیر باقی نہیں، اب کوئی آس نہیں، کوئی شکوہ نہیں، تنہا تہی دامن جانے کس لمحے کا منتظر ہوں، جب پوپ جان کا آخری وقت آیا تو اُس نے کہا تھا "میرا رختِ سفر بندھ چکا ہے، مَیں جانے کے لیے تیار ہوں"۔

کَبُرَنَا مَوْتُ الْکُبَرَا

بڑوں کی موت نے بڑا کر دیا لیکن جب "طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا" وہ ہو جو ہے، جب پرانے بادہ کش اُٹھ جائیں اور کوئی "حریفِ مئے مردافگنِ عشق" باقی نہ رہے تو اے ندیم میں خوں کے آنسو کیوں نہ روؤں

گردِ فناست زندحریفانِ بزمِ عشق

کیسے کیسے لوگ اُٹھ گئے لیکن چاند پہ خونیں لکیر نہیں آئی، دامانِ صبا میلا نہیں ہوا، پہاڑ کی اوٹ میں شرمیلا چشم ڈوبتے سُورج کی کرنوں سے زرنگار ہے، ہاں دِلوں

کے زخم کون دیکھ سکتا ہے۔

دِل دریا سمندروں ڈوھنگا کون دلاں دیاں جانے ہُو

اس تاروں بھرے آسمان نے زندگی کا مد وجزر دیکھا، قوموں کے عروج و زوال کا نظارہ کیا، ایک ایسی ہی رات تھی جب جواں سال، جواں بخت سکندر نے بدنصیب دارا کا لشکر تہ تیغ کر کے اس کا زخمی سر اپنے زانو پہ رکھ لیا تھا

سرِ خستہ را بر سرِ راں نہاد

شبِ تیرہ بر روزِ رخشاں نہاد
(فردوسی)

'گنبدِ آبگینہ رنگ' کبھی راحت کا سندیسہ لاتا ہے، کبھی اس میں درد کی لہریں اُٹھتی ہیں اور خُون کی ندی موجزن ہوتی ہے، یہ آسمان سہاگ رات آغوش میں لیے ہے اور ایسی رات کو بھی جب غم کی خُون آشام تلوار رُوح کی گہرائیوں تک کاٹتی چلی جاتی ہے، خاوند کی جُدائی پر بیوی کا غم، وہ کرب جس کی شدّت حیطۂ تحریر میں نہیں آسکتی، بچّوں کا احساسِ محرومی، دوستوں کی زندگی میں خلا جسے کوئی پُر نہیں کرسکتا۔

یہ تخلیق کا معجزہ ہے کہ ہر انسان منفرد ہے، اُس کا ہر خیال اچھوتا ہے اور تکرار کا متحمّل نہیں، پھر رشتۂ مودت میں منسلک کرنے والی وہ کڑی جو تعریف سے ماورا ہے کونسی ہے؟ وہ یگانگی اور ہم آہنگی جو باہمی اُنس پر منتج ہوتی ہے، جس سے دو متنفس ایک دوسرے کے دل میں گھر کرتے ہیں؟ شاید اچھوتی خوبیاں اور نادر خیالات ایک شخصیّت میں مجتمع ہونے سے ہماری محبوب شخصیّت بن جاتی ہے، انجانے طور پر دِل اُس کی جانب کھنچتا ہے، آنکھیں اُسے ڈھونڈتی ہیں اور اُس کی جُدائی شاق گزرتی ہے۔

یہ کون لوگ تھے جو شہابِ ثاقب کی مانند تیرگی کو چیرتے ہوئے، جلو میں نُور کی لکیر چھوڑتے ہوئے گزر گئے؟ صد حیف احباب آناً فاناً چل بسے

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند

لیکنؔ ہزار بادۂ ناخوردہ، ابھی رگِ تاک، میں تھے، افسوس وہ پیش از وقت اُٹھ گئے۔

اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید ولے نہ از دلِ ما
مادست زِغم نہادہ برسر
غم پائے فشرد در گلِ ما
(فیضی)

ایسا اتفاق بھی ہوا کہ میاں محمد شفیع سے ہفتوں ملاقات نہ ہو سکی، یہی چھوٹی چھوٹی مصروفیتیں، دُنیا کے بکھیڑے، اس پہ مستزاد یہ خوش فہمی کہ وہ پڑوس میں تو ہیں، اُن کے ساتھ تو کبھی بھی محفل جم سکتی ہے اور ہوتا بھی یہی کہ جب کبھی ملاقات ہو جاتی وہ اسی بے لوث محبّت اور گرم جوشی سے ملتے جو اُن کی طبیعت کا خاصہ تھی۔

آج ایک سال بیت گیا اور تلخابۂ زیست کا ایک گھونٹ کم ہو چکا، عید کے اگلے روز میاں صاحب ہمارے ہاں تشریف لائے، پائیں باغ میں کرُسیاں بچھا دی گئیں اور بڑی متانت کے ساتھ

چہ خوش است از دو یکدل سرِ حرف باز کردن
سخنِ گذشتہ گفتن گِلہ را دراز کردن
(نظیریؔ)

کا سلسلہ شروع ہوا، کہنے لگے بعض دفعہ انسان کو آگ میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اُس پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے، داماد کی خودکشی پر میرے ساتھ یہی کچھ ہوا لیکن ایسے وقت میں انسان انسان کے کام آتا ہے، ایک ایسے شخص نے میری دم سازی کی جس سے کوئی قرابت داری نہ تھی، ہر وقت اُس کی رفاقت مجھے حاصل رہی، ہر حیلے اور ہر بہانے سے اُس نے میری دلجوئی کی، جب دل غم سے بوجھل تھا اُس نے بوجھ ہلکا کرنے میں بڑی تگ و دَو کی۔

'انسان انسان کے کام آتا ہے' خود اُن کی زندگی اس حقیقت کی تفسیر تھی، وہ سادگی، خلوص، اور شرافت کا پیکر تھے لیکن مرنجاں مرنج انسان ہونے کے باوجود زیادتی اور

بے انصافی کے خلاف سینہ سپر ہو جاتے، جب ایک دوست جنھیں وہ بے قصور سمجھتے تھے سیکیورٹی ایکٹ کے تحت جیل خانے بھیج دیئے گئے تو دونوں وقت کا کھانا میاں صاحب کے گھر سے جاتا رہا، ایسی بے خوفی کی ایک زندہ مثال اُن کی کتاب ۱۸۵۷ء ہے جس میں اُنہوں نے اُن زعما کا کھُلے بندوں ذکر کیا جنھوں نے جنگِ آزادی میں سفید فام آقاؤں کی طرفداری کرکے جاگیریں حاصل کی تھیں حالانکہ مصلحتِ وقت کا تقاضہ تھا کہ وہ خاموش رہتے۔

اوّلین ملاقاتوں کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، ہم ایک محفلِ سرود میں حاضر تھے، مغنّی نے دھیمے سُروں میں راگ چھیڑا تو میاں صاحب نے جُھک کے سرگوشی کے انداز میں کہا "یہ جےجے ونتی ہے، رات گئے کا راگ"۔ اسی زمانے میں انہوں نے اصغر گونڈوی کا قصّہ سنایا تھا جو کبھی لاہور میں اُن کے مہمان رہے تھے، میاں صاحب فرمانے لگے کہ اصغر صاحب علی الصباح اپنا ہینڈ بیگ اُٹھا کر عینک بیچنے نکل جاتے لیکن استغنا کا یہ عالم تھا کہ جب دو عینکیں بِک جاتیں تو لوٹ آتے اور کہتے یہ گزر اوقات کے لیے کافی ہے، پھر میاں صاحب نے اصغر کے تین پسندیدہ اشعار سنائے:

اُس نے نگاہ ڈال دی مجھ پہ ذرا سرُور میں
صاف ڈبو دیا مجھے موجِ مئے طہور میں

تیری ہزار برتری، تیری ہزار مصلحت
میری ہر اک شکست میں، میرے ہر اک قصور میں

خیرگیِ نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں
اور بھی دُور ہو گئے آ کے تیرے حضور میں

کچھ عرصہ ہوا وہ میرے دفتر میں تشریف لائے وہاں شیشے کی تختی پر یہ شعر کندہ تھا:

خواجۂ من نگاہ دار آبروئے گدائے خویش
آں کہ زجُوئے دیگراں پُر نہ کند پیالہ را

اور نیچے لکھا تھا "خواجہ معین الدین" میاں صاحب نے فوراً کہا "یہ علامہ اقبال کا شعر ہے، زبورِ عجم کی چوتھی غزل" چند ماہ بعد یہ عقدہ کھلا کہ کسی عقیدت مند نے یہ شعر اجمیر شریف کی درگاہ پہ نذر کرنے کی نیت سے لکھوایا تھا، حسنِ اتفاق دیکھئے یہ شعر خود اُن پہ صادق آتا تھا۔

میرے ذہن میں سیر کے دوران مُڈبھیڑ کی تصویر اُبھرتی ہے، چُست بادامی رنگ کا کوٹ، نکلتا ہوا قد، چال میں نوجوانوں کا سا عزم، منزل کو پا لینے کی دُھن، ذرا سی بات سے چہرے پہ مسکراہٹ پھیل جاتی، ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم، اُردو فارسی اور انگریزی زباں پہ عبور، منجھا ہوا اندازِ گفتگو، اپنا نقطۂ نظر منوانے کے لیے نہ سخت الفاظ چُنتے نہ درشت لہجہ اختیار کرتے، سچ تو یوں ہے کہ وہ اپنی ذات سے اک انجمن، تھے، ہر ملاقات میں چٹکلے لطیفے اور منتخب اشعار یا مذہب، تاریخ، آثارِ قدیمہ، ادبیات اور سیاسیات پہ بحث، اقبال کہتے ہیں:

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی\
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

تو وہ آدابِ جہاں بینی سے آگاہ تھے، خطاطی کا اُنہیں شوق تھا، رموزِ بےخودی پڑھنے کے لیے علامہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا تھا، اپنی کتاب ۱۸۵۷ لکھنے کے لیے اُنہوں نے چند ماہ کی رُخصت لے لی تھی، اُس زمانے میں مجھ سے کہنے لگے "یہ ایک یادگار چیز ہو گی۔ ملازمت میں اگر بیس برس اور محنت کروں تو اس کے پاسنگ نہ ہو گی۔"

وہ قنوطیت سے دُور تھے، رجائیت اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا، جب چار سُو اندھیرا چھا جاتا اور اُن کے دوست حسرت و درماندگیٔ دل کا ذکر کرتے تو وہ اُمید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے، نہیں معلوم کتنے لوگوں نے اس زندگی سے جلا پائی، اس لحاظ سے میاں صاحب خوش قسمت انسان تھے، اُنہیں نوجوانوں سے اُنس تھا، اُن کی توقعات نئی پود سے وابستہ تھیں جن کے بشاش، پُرامید اور تابناک چہروں میں وہ آنے والے پاکستان

کی جھلک دیکھتے تھے۔

ونسٹن چرچل کسی کے متعلق لکھتے ہیں :

HE BORE ADVERSITY WITH DIGNITY

میاں صاحب نے زندگی کی ترشی مسکرا کر برداشت کی اور سرکاری ملازمت کے نشیب و فراز تحمّل اور حوصلے کے ساتھ طے کیے، نامساعد حالات میں بھی وہ باوقار رہے، لاہور کارپوریشن سے علیحدہ ہونے پر وہ دل برداشتہ ضرور تھے لیکن ان کا کہنا تھا "میں وہ کچھ نہیں کر سکتا جس کی توقع اربابِ بست و کشاد مجھ سے کرتے ہیں، عزّتِ نفس کا سودا نہیں ہو سکتا، میں طویل رخصت پر جا رہا ہوں"۔

میاں صاحب چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہو جاتے پھر اصرار اور تکرار کے ساتھ شکریہ ادا کرتے، احسان مندی کا مادہ اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھا، وہ ایک اسکول کے بانی تھے، ایک مثالی درس گاہ جہاں علوم متداولہ کے علاوہ وہ بچّوں کے اخلاق سنوارنا چاہتے تھے، شروع شروع میں ادارہ مالی مشکلات سے دوچار تھا، جب اُن کی کوشش سے سرکاری امداد مل گئی تو وہ ہر اہل کار کے یوں ممنونِ احسان ہو رہے تھے جیسے وہ قومی نہیں اُن کا ذاتی کام تھا۔

۱۹۵۴ء میں مَیں دوسری مرتبہ ملتان گیا تو میاں صاحب لاہور آ چکے تھے، وہاں باتوں باتوں میں ایک سفیر سے ذکر آ گیا کہ قلعۂ ملتان کے ویرانے کو گل و گلزار بنانے میں کس کا ہاتھ تھا، اتفاق سے انہیں اس گفتگو کا علم ہو گیا، اس معمولی بات کے لیے بھی اُنہوں نے شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا، خلوص لہجے سے ترشح تھا، وہ رسمی تشکّر نہ تھا۔

بٹوارے کے بعد ایک شاعر ملتان پہنچے تو میاں صاحب نے گزر اوقات کے لیے اُنہیں ایک چکّی الاٹ کروا دی، ایک روز میاں صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے اُنہیں شرارت سُوجھی، پوچھنے لگے "آپ کی وجاہت کا آج یہ عالم ہے تو شباب میں خدا معلوم کیا ہو گا،

آپ تھے بھی انگلستان میں، وہاں کون نہ مرمٹا ہوگا!" میاں صاحب کی غلافی آنکھیں شرمگیں ہوگئیں، بے حد متانت سے کہنے لگے " ہاں انگلستان میں ایک دفعہ ایک لڑکی نے مجھے ناحق روکے رکھا اور اصرار کے باوجود نہ جانے دیا، لینڈ لیڈی گرجا میں میرا انتظار کررہی تھی، اُس روز مجھے بڑی خِفت اُٹھانی پڑی تھی"۔

مجھے میاں صاحب کی رفاقت آج بھی حاصل ہے، وہ مسکراہٹ جو چہرے پہ کھِل جاتی تھی آج بھی نظر کے سامنے ہے، گردن کو ذرا نیہوڑا کے خطاب کرنا، پیار کے ساتھ الف کو ذرا کھینچ کے " منظور صاحب" کہنا، یہ متحرک تصویریں میں دیکھتا ہوں، وہ آواز سُنتا ہوں جس سے کان آشنا ہیں،

اے لوگو! یہ جہانِ گزراں ہے

جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محمل ہا

لوحِ جہاں سے نقوش مٹتے رہتے ہیں، فانی چیزوں سے محبّت کرلو، پھولوں سے، بچّوں سے، کھلونوں سے دل بہلالو۔

تَمَتَّعْ مِنْ شَمِيمِ عَرَارِ نَجْدٍ

وَمَا بَعْدَ العَشِيَّةِ مِنْ عَرَارِ

(نجد کی خوشبودار گھاس سے جی بھر کے لُطف اندوز ہولو، یہ ایک ہی شام بہار آور ہوتی ہے!)

'کشاکشِ غمِ پنہاں' سے فرصت ملے تو ہم نفسوں کے ساتھ محفل سجالو، طویل نشست، صحبتِ گرم، مبادا کوئی حسرت باقی رہ جائے .... لیکن اس درد کا درماں نہیں، دُنیا کا میلہ یکدم درہم برہم نہیں ہوجاتا، ایک روز ہم ایسے 'درماندہ راہرو' ضرور کہیں گے۔

چہ خوش بودی اے دل دریں دیرِ فانی
کہ کس را بکس آشنائی نہ بودی
وگر زانکہ بودی بیاران ہمدم!
فلک را سرِ بے وفائی نہ بودی

(ابن یمین)

شاید زندگی اور موت کو صرف روشنی اور تاریکی سے تعبیر نہیں کر سکتے، بجائے خود زندگی نُور اور ظلمت کی ٹکڑیوں کا مرقّع ہے، دُنیوی رشتوں سے بالا، محبّت کے رشتے میں منسلک دو دِلوں کا دھڑکنا زندگی ہے، دوستوں اور عزیزوں کی تپش زنی موت کے مترادف ہے، یہ متوازی خطوط مرتکز ہوتے ہیں تو زندگی پر، یوں بھی مرنے سے پہلے انسان متعدد بار مرتا ہے، کبھی ایک چرکا لگ گیا، کبھی زخمِ کاری، پھر ایسے محرکات بھی ہیں ــــ حق و باطل کی جنگ، زیردستوں کی حمایت، جو نیم جان انسان کو زندگی کی شاہراہ پر لاکھڑا کرتے ہیں، انصاف سے انحراف، حق کی بات کہنے سے پہلو تہی یا ضمیر کا سودا موت نہیں تو کیا ہے؟ وہ موت، جو جسم کی تحلیل سے بہت پہلے واقع ہو جاتی ہے، بہت سے لوگ سالہا سال اپنی زندہ لاش اٹھائے پھرتے ہیں ....

طالب علمی کے زمانے میں یہ سبق از بر تھا:

"بچّو! دیکھنا زندگی اکارت نہ جائے، دن رات ایک کر کے کوئی قابلِ قدر کام کر ڈالنا، اسکول میں ہر صبح اس دُعا کا اعادہ ہوتا تھا۔

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنّا میری
زندگی شمع کی صُورت ہو خدایا میری

دُور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

(اقبالؔ)

یا قرآن کریم کی اس دُعا کا

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ (سورہ آلِ عمران)

(اے اللہ! ہدایت عطا فرمانے کے بعد ہمارے دلوں کو کج رو نہ بنا،

اپنی جناب سے ہم پر رحمت عنایت کر، تو ہی ہر چیز عطا فرمانے والا ہے)

اُن جلیل مقاصد کا کیا ہوا؟ زندگی کے کس موڑ پر وہ نظر سے اوجھل ہو گئے؟ مقصدِ حیات کیا تھا؟ کیا میں زندگی کا عظیم تحفہ پانے کا اہل تھا؟ اگلے روز ایک دوست پوچھ رہا تھا، کبھی بیلنس شیٹ بھی بنائی ہے؟ کچھ عاقبت کا بھی خیال ہے؟

یار فرید پیا تد لگ سی
جدن چڑھی پھتّی ہتھ بازاں

ہم میں سے بیشتر نیک تمنّاؤں کے اظہار پر اکتفا کرتے ہیں یا کمرِ ہمّت باندھنے میں اتنا وقت صرف کر دیتے ہیں کہ 'جنگ' ختم ہو چکتی ہے، میاں شفیع جیسے علو ہمّت لوگ یہ راز پا جاتے ہیں کہ مہلت چند روزہ ہے اور زندگی میں وہ کچھ کر ڈالتے ہیں جو اپنی دانست میں انہیں کرنا چاہیئے تھا، وہ تمام عمر ہمتّوں کی پستی اور شوق کی بلندی کا تقابل نہیں کرتے، اس کے باوجود بہت سے شاہکار ادھورے رہ جاتے ہیں، شہ پارے اَن کہے رہ جاتے ہیں۔

میّت لندن سے آ رہی تھی، ایئر پورٹ پہ عزیز و اقارب کا ہجوم تھا، اُن کی محبّت کی یاد میں آنسو اُمنڈے پڑتے تھے، شدّتِ غم سے گلے رندھ گئے تھے، واپسی پر..... . . . صاحب راستے میں کہنے لگے "میاں صاحب کی اہلیہ نے فون پہ چند مسائل کا ذکر کیا تھا، مَیں نے کہا تھا آپ فکر نہ کریں، یہ چیزیں طے ہو جائیں گی" یہ کہتے ہوئے اُن کی آواز بھرا آئی "جب یہی حشر ہونا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ فرعونیت کا مظاہرہ کیوں

کرتے ہیں، اُن کا تحکمانہ انداز، اُن کے طور طریقے، جیسے وہ حکومت کرنے کے لیے ہی پیدا ہوئے تھے"۔ وہ کار چلاتے ہوئے زار و قطار رو رہے تھے .... ایک سینئر افسر جو اپنے لااُبالی پن کے لیے مشہور تھے !

دودھیا چاندنی میں نہلائے ہوئے بادلوں کے اُوپر پرواز کرتے ہوئے مَیں نے سوچا کہ پیاروں کی روحیں ایسے میں سمیں جھیلوں کی طرف اُڑ جاتی ہوں گی، مجازی کثافتیں دُھل جاتی ہوں گی، رُوح لطیف ترین شے کی طرح منزّہ ہو کر اپنے حقیقی گھر لوٹتی ہو گی۔

تا بفراغِ خاطرے نغمۂ تازۂ زنم
باز بہ مرغزار دہ طائرِ مرغزار را

(اقبال)

۱۹۶۴ء — ۱۹۶۷ء

قرۃ العین طاہرہ

زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہو کر میں نے کئی بار محبت کی ، وہ چھٹپنے کی محبت ہو یا عنفوانِ شباب کی ، شمالی برما کے دلآویز سبزہ زار ، پچمری کی پُر اسرار گھاٹیاں ، ہسپانوی مورسبھی پر اس محبت کا سایہ پڑا تھا ۔ وہ شیفتگی کبھی کلامِ اقبال سے ہوئی تو کبھی عفت و عصمت کی دیوی سیتا کے ساتھ ہیں نے کئی بار سوچا وہ آتش تولیے جسے زمانہ قرۃ العین کے نام سے جانتا ہے جسمانی ہیولیٰ میں کیسی ہوگی ؟ زریں تاج کا خطاب پانے والی مقہور و مغضوب ، راندۂ درگاہ ہوئی اور قزاقوں کی طرح بھاگی پھری ، وہ یارانِ صادق الولا کون تھے جنہوں نے اُسے پناہ دی ۔ یہ حسرت رہی کہ عالمِ رُویا میں اُس عظیم شاعرہ کا دیدار کر سکوں جو زندگی میں سیماب گوں تھی ، اگر انسان کبھی ماضی کی طرف لوٹ سکا اور سرودِ رفتہ کے ساتھ اُن حوادث کو آواز دے سکا جو تاریخ کے سینے میں آسودہ ہیں اور جن کی حیثیت اساطیر کی ہے تو میں وہ جانسوز نظارہ دیکھنے کی تمنا کروں گا جب قرۃ العین کو پابجولاں سلطانِ وقت کے سامنے لایا گیا ، تو اختیار مسلک کے عشق میں وہ آپے سے باہر تھی ، فرطِ غضب سے اُس پر جنونی کیفیت طاری تھی ۔ زُلفیں پریشان ہو کر اُڑ رہی تھیں ۔ آنکھیں شعلہ بار تھیں اور

منہ سے کف جاری تھا۔ ناصرالدین قاچار سنگدل سہی لیکن اس منظر کی تاب نہ لاسکا اور کہہ اُٹھا ــــ بگزارید کہ صورتِ زیبا دارد ــــ کہاں کا فتویٰ، کہاں کا فرمانِ موت؛ لوگ ہزار کہیں کہ کشتنی ہے ناصرالدین پہ اُس ساحرہ کا جادو چل چکا تھا۔

کبھی رات کی گہری خاموشی میں ذہن کے گوشے گوشے میں یہ نغمہ گونج اُٹھتا ہے

گر بتو اُفتدم نظر چہرہ بچہرہ رُو برُو

عمرہ سے واپسی پر ایک دوست نے آکسفورڈ کے فارغ التحصیل ایک عرب کا قصّہ سنایا جو مدینہ میں روضۂ مبارک کے سامنے مقیم تھے، کسبِ حلال کے لیے لکڑ ہارے کا کام کرتے اور عشقِ مصطفےٰ میں غرق رہتے۔ اُنہیں یہ سُن کر حیرت ہوئی کہ گنبدِ خضریٰ کا رنگ مدھم پڑ گیا ہے "میری نظر حضورؐ کے قدموں پر رہی، نگاہ اُٹھانے کی جسارت نہ کرسکا!"

عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جُو رہی میری نگاہِ بے ادب (اقبالؔ)

اور یہاں یہ خود اعتمادی

گر بتو اُفتدم نظر چہرہ بچہرہ رُو برُو
شرح دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مُو بہ مُو

حضرت موسیٰؑ اُس چرواہے پر خشمگیں تھے جسے محبوب کی زُلفوں میں شانہ کرنے اور اُس کے کپڑے سینے کی تمنّا تھی اور کہتا تھا اے خدا! تو کہیں مل جائے تو خُود لا کے تجھے مزے مزے کے کھانے کھلاؤں اور سامنے بیٹھا دیکھا کروں

تو کجائی تا سرت شانہ کنم — چارقت را دوزم و بخیہ زنم
سازم و آرم بہ پیشت صبح و شام — از من آوردن ز تو خوردن طعام

(مثنوی مولانا روم)

بجز اس کے کہ بلاواسطہ تخاطب میں ایک دہقان کی سادگی ہے اور ہزاروں تمنائیں اس شعر میں غلطاں و پیچاں ہیں۔

گر بتو افتدم نظر چہرہ بچہرہ رُو برُو
شرح دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مُو بہ مُو

اس کے باوجود خطاب میں بلند حوصلگی اور بے باکی ہے، کہاں وصل میں تشنگیِ آرزو اور حسرتِ قرب!

چہ قیامتی کہ نمی رسی زِ کنارِ ما بکنارِ ما

اور کہاں

شرح دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مُو بہ مُو

محبّت کی ہمہ گیری کے سامنے وہ عاجز تھی۔ اُس نے سپر ڈال دی تھی اور شوقِ سپردگی میں اقرار کر لیا تھا

مہرِ ترا دلِ حزیں بافتہ بر قماشِ جاں
رشتہ بہ رشتہ نخ بہ نخ تار بہ تار پو بہ پو

"تم میری رُوح کے دیدار سے کیا لوگے؟ میری یاد ایک بہتان سے ملوث ہے، جسم رُوح کی عفّت کے لیے زینۂ نور سہی لیکن جسم کی تطہیر کے داعی عشق و نفس کی لذّت سے ناآشنا ہیں، محمّد علی بار فروش! دنیا قصّے بنانا خوب جانتی ہے، لاکھ نیکیاں بھلا کر ایک عیب پکڑ لیتی ہے۔

"میں نے ناز و نعم کے گہوارے میں آنکھ کھولی۔ قدرت کا کوئی انعام ایسا نہ تھا جو مجھے ودیعت نہ ہوا ہو۔ جاہ و حشم، دینی و دنیوی علوم، حسنِ خداداد، ذہانت و فطانت، شعر کہنے کے لیے موزوں طبیعت، والد نے مجھے اُمِّ سلمیٰ پکارا، میرے اُستاد کاظم رشتی نے قرۃ العین کا نام دیا اور بہاء اللہ نے طاہرہ کے لقب سے نوازا۔

میرا والد سوبہ قزوین کا مجتہدِ اعظم تھا، وہ بڑا علم دوست انسان تھا، قزوین سے کچھ دُور ایک گاؤں اُس نے مجھے بہ طور تحفہ دیا تھا جس کا نام میں نے بہجت آباد رکھا، شہری جھمیلوں سے طبیعت گھبراتی تو میں اُس کنجِ عافیت میں پناہ ڈھونڈتی اور مطالعہ میں گم ہو جاتی۔ جب میں نے سنا کہ میری بہن مرضیہؔ کا خاوند ایک طویل سفر پر جا رہا ہے تو میں نے اُسے ایک سر بمہر خط دیا کہ اُس موعودہ ہستی کو پہنچا دے جس کی مجھے مدّت سے جستجو تھی۔ مجھے یقین تھا کہ مرزا محمّد علی اُس مردِ کامل کو ضرور ملے گا۔ جب باب کو میرا خط ملا تو اُس نے مجھے مریدانِ خاص کے حلقہ میں داخل کر لیا۔ باب ہمیں حروفِ حیّ کہتا تھا اور اپنے آپ کو 'نقطہ' گو عالمِ رویا میں متعدد بار دیدارِ دوست سے شاد کام ہوئی اور میری چشمِ بصیرت نے سب سے پہلے اسے پہچانا لیکن محرومیٔ قسمت دیکھئے "حروفِ حیّ" میں سے ایک میں ہی تھی جو عالمِ آب و گِل میں اس کے دیدار سے محروم رہی، باب کے فراق میں مَیں نے متعدد نظمیں لکھیں، میرے شوق کا اندازہ اس شعر سے کرو ؎

لمعاتُ وجھکَ اشرقت وشعاعُ طلعتکِ اعتلیٰ
زچہ رُو الستُ بربّکم نہ زنی بزن کہ بلیٰ بلیٰ

"جب اُس نے ایک نئے مسلک کی داغ بیل ڈالی تو ایران میں حکومت کی اساس تشدّد اور جارحیت پر تھی جس سے مذہب کو دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ لاقانونیت کا دَور دَورہ تھا، شاہ ایک مطلق العنان حکمران تھا۔ وزیر اور صوبائی گورنر تو ایک طرف، قریہ کے نمبردار تک میں شاہانہ آمریت کی جھلک دکھائی دیتی تھی، کوئی عدالت ایسی نہ تھی جو شاہ کے احکام میں مداخلت کر سکے۔"

"میری نظر میں باب ایک دِھا پُرش تھا، چہ عجب کہ میرے شوق کی ہمہ گیری نئے پیغام کی ترویج کے لیے وقف ہو گئی، جب میں ماضی بعید کی جھلستی راتوں کا نظارہ

کرتی ہوں نوجیران ہوتی ہوں کہ نئے مذہب نے میری نس نس میں چنگاریاں بھر دی تھیں، میری تقریروں کی روانی دلوں کو رام کرتی رہی، روایت کی آہنی زنجیریں پگھلتی رہیں، اُس سیّال سے ایک انی تیار ہوتی رہی جسے میرے سینے میں پیوست ہونا تھا، قزوین لوٹی تو میں یکسر بدل چکی تھی، میرا عم زاد خاوند ملّا محمدؐ میرے برق تاب خیالات کا ساتھ کہاں دے سکتا تھا، پھر وہ باب کا منکر تھا، ہماری علیحدگی ناگزیر تھی، انہی دنوں مُلّا تقی قتل ہوا، مُلّا محمدؐ نے اپنے والد کا خُون میرے سر تھوپا، ایک روز گریباں چاک کر کے محمدؐ شاہ کے حضور حاضر ہوا اور فریاد کی "مُلّا تقی قتل کر دیا گیا کیا اُس کا خون رائیگاں جائے گا ؟" محمدؐ شاہ نے کہا "اصل قاتل بھاگ گیا ہے، شریعت کا کوئی قاضی اس کی بجائے کسی معصوم کو سزائے موت نہ دے گا، تمہیں آتشِ انتقام جُھائی ہے تو شرع کو بیچ میں کیوں لاتے ہو ؟ یہ تھی بساط میرے جیون ساتھی مُلّا محمدؐ کی !

" سیّد کاظم رشتی ایک جیّد عالم تھے، ایک مدّت میری اُن سے خط و کتابت رہی، کربلا میں اُن کے جانشین کی حیثیت سے مَیں نے پسِ نقاب درس دیا، بعض لوگ میری مقبولیت برداشت نہ کر سکے اور درپے آزار ہوئے، میں نے بغداد کی طرف ہجرت کی، یہاں بھی میری شعلہ نوائی نے دلوں کو موہ لیا، میرے خطبات مخصوص طبقے کی اجارہ داری کو کھُلا چیلنج تھے، یہ اعلان کہ شرع میں ردّ و بدل ہو سکتا ہے قابلِ عفو کیسے ہوتا ؟ ہماری شدید مخالفت لازمی تھی، بابیوں کا شیرازہ منتشر کر دیا گیا، باب کو سزائے موت ہوئی، اُس کے نائبین چُن چُن کے قتل کر دیئے گئے۔

" بادشت سے لوٹتے ہوئے مجھے گرفتار کر کے محمود خاں کلانتر کے گھر نظر بند کر دیا گیا، قید ایسی سخت نہ تھی، کلانتر کی بیوی نے میرا تعارف اُونچے طبقے کی بیگمات سے کروا دیا تھا جو بکمال تلطّف پیش آتیں، سچ تو یہ ہے کہ قیامِ تہران کے دوران میری شہرت کا آفتاب نصف النّہار پہ تھا۔

"دن شبنم آسا گزر رہے تھے کہ ایک عاقبت نااندیش بابی نے باب کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے ناصر الدین پر قاتلانہ حملہ کر دیا، شاہ بچ گیا لیکن بابی سازش کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے، شاہ اور وزیر میری ہر دلعزیزی سے خائف تھے مگر مقدمہ چلائے بغیر سزائے موت دینے سے ہچکچاتے تھے، حکم ہوا کہ تہران کے دو مجتہد بحث و تمحیص کے بعد طے کریں کہ میں کس حد تک قصور وار ہوں لیکن استدلال کی گنجائش کہاں تھی، مآل معلوم تھا، انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہ عورت خود گمراہ ہے اور دوسروں کو گمراہ کرتی ہے۔

"وہ بھی کیا دن تھا، مجھے نوید مل چکی تھی کہ آخری وقت آ پہنچا ہے، میں نے عرقِ گلاب سے غسل کر کے بہترین سفید جامہ زیب تن کیا اور اہلِ خانہ کو بتا دیا کہ میں ایک طویل سفر پر جا رہی ہوں۔

"ڈی گوبینو نے میرے جلائے جانے کا قصہ درست نہیں لکھا، قدرت کو یہی منظور تھا کہ طاہرہ ایک مستِ شراب حبشی کی پھانس کا شکار ہو، اُس کی نیم جاں لاش کو ایک اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا جائے اور کوڑا کرکٹ سے وہ کنواں پاٹ دیا جائے۔

گیرم کہ وقتِ ذبح طپیدن گناہِ من
دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہِ کیست!

(غالبؔ)

"فلکِ مشتری کی سیر کے دوران زندہ رُود نے مجھے 'خاتونِ عجم' کے نام سے یاد کیا، میرا چہرہ سوزِ دروں سے 'درخشندہ' تھا اور سینہ 'سوزانِ گیتی گداز'،

سینہ بکشودیم و خلقے دید کا نجا آتش است

اُس نے میرے 'شوقِ بے حد' اور شوقِ شہادت کی صحیح عکاسی کی تھی

شوقِ بے حد پردہ ہا را بر درد ۔۔۔ کہنگی را از تماشا می برد!
آخر از دار و رسن گیرد نصیب ۔۔۔ برنگردد زندہ از کوئے حبیب!

(اقبالؔ)

"میرے ہمعصر پوچھتے تھے عزّت، دولت، آرام و آسائش تج کے میں نے کیا پایا؟ اُنھیں کون سمجھاتا کہ زندگی وقف کر دینے میں حقیقی مسرّت کا راز پنہاں ہے کسی میں کھو کر ہم اپنے آپ کو پا لیتے ہیں۔"

در دلِ ما غمِ دُنیا غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

(عرفی)

۱۹۵۶ء